ماہنامہ

اشراق

لاہور

مارچ ۲۰۱۲

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

”...خدا کو یاد کرنے والوں کا زمرہ یہ ہے۔ وہ زمین پر رہتے بستے ہیں، مگر اُن کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہوتا ہے جو اپنے پروردگار کی بندگی سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے مانتے ہیں کہ اُن کا خالق بے عیب، بے نقص اور بے خطا ہے، ہر قسم کی کمزوریوں سے منزہ ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، وہ بے ہمتا اور بے مثل ہے۔ وہ زبان سے بھی دائماً اِسی حقیقت کا اعتراف و اعلان کرتے اور اُسی کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔“

—— قرآنیات

دارالاشراق

المورد

شذرات

علم کی بنیاد | جاوید احمد غامدی | ۲

قرآنیات

الاعراف (۱۰) | جاوید احمد غامدی | ۵

معارف نبوی

تعیین خبائث | محمد رفیع مفتی | ۲۳

دین و دانش

قرآن مجید بطور کتاب تذکیر۔ چند توجہ طلب پہلو | محمد عمار خان ناصر | ۳۱

نقطۂ نظر

عہد رسالت میں خواتین کا سیاسی کردار (۵) | پروفیسر خورشید عالم | ۴۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جلد ۲۴ شمارہ ۳ مارچ ۲۰۱۲ ربیع الثانی ۱۴۳۳

جاوید احمد غامدی

علم کی بنیاد

علم کا اولین موضوع کیا ہے؟ ایک راے یہ ہو سکتی ہے کہ علم کا اولین موضوع وجود ہے، اِس لیے کہ علم خود من جملہ موجودات ہے اور موجودات پر بحث سے پہلے وجود کی حقیقت زیر بحث آنی چاہیے۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ موجود کی اِس حیثیت سے قطع نظر کر لیا جائے کہ وہ معلوم ہے تو اُس پر بحث نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ بحث سے پہلے اگر حق کو باطل اور صحیح کو غلط سے الگ پہچاننے کا کوئی معیار متعین نہ ہو تو ہم اپنے نتائج علمی پر مطمئن کس طرح ہوں گے؟ دوسری راے یہ ہو سکتی ہے کہ علم کا اولین موضوع نفس ہے، لیکن اِس میں بھی وہی مشکل ہے جو اوپر وجود سے متعلق بیان ہوئی۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ علم کا اولین موضوع خود علم ہی کو قرار دیا جائے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ علم نفس کے احوال میں سے ہے اور ذات ہمیشہ صفات و احوال پر مقدم ہوتی ہے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ صفات پر بحث کو ذات کی بحث کے تابع ہونا چاہیے۔ مگر ذات کی بحث کیا ہے؟ یہ اگر غور کیجیے تو صفات ہی کی بحث ہے، خاص طور پر اُس صفت کی جو تمام صفات میں سب سے خاص، سب سے مقدم اور سب سے بڑھ کر اُس کی ماہیت میں داخل ہو۔ نفس کے احوال میں علم کی حیثیت یہی ہے، اِس لیے کوئی چارہ نہیں کہ سب سے پہلے خود علم کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

امام حمید الدین فراہی کے علوم و معارف میں جس چیز کو منطق اعلیٰ یا میزان سے تعبیر کیا گیا ہے، اُس کا موضوع یہی ہے۔ امام نے متنبہ فرمایا ہے کہ یہ وہ منطق نہیں ہے جس کی ابتدا ''اورجانون'' (organon) کے مصنف سے ہوئی تھی۔* اِس لیے کہ وہ منطق اُس علم سے بحث کرتی ہے جس کا اکتساب اولیات سے استدلال کے طریقے پر کیا جاتا

ہے۔ یہ اولیات اُس کا موضوع نہیں ہیں، اِنھیں اصول موضوعہ کی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ اِن پر بحث کا موقع علم مابعدالطبیعیات میں ہے، مگر اِس علم کو دیکھا جائے تو اِس کے موضوعات عدد، وجود اور اِس نوعیت کے دوسرے مقولات ہیں جنھیں زیادہ سے زیادہ معلومات عامہ کہا جا سکتا ہے۔ علم کی بنیاد کیا ہے؟ اِس پر اُس میں بھی کوئی بحث نہیں کی گئی۔ چنانچہ تمام عمارت ہوا پر قائم ہے اور تشکیک و جہالت کے جس دروازے کو بند کرنے کے لیے اِس تمام جدوجہد کی ابتدا ہوئی تھی، وہ اُسی طرح کھلا رہ گیا ہے، جس طرح اِس فن کی ترتیب و تدوین سے پہلے کھلا ہوا تھا۔

امام نے لکھا ہے کہ اِس عنوان کے تحت اُس چیز پر بحث ہونی چاہیے جس سے علم اضطراراً اور سب سے پہلے متعلق ہوتا اور اُس کے ضروری قضایا متعین ہو جاتے ہیں۔ یہاں کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ اِس سے اُن کی مراد اولیات ہیں۔ ہرگز نہیں، یہ اُن سے پہلے کی چیز ہے جسے وہ بنائے علم کہتے ہیں، جو اگر منہدم ہو جائے تو علوم کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے، بلکہ خود علم و یقین کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اِس معاملے میں غلطی کھائی ہے، وہ اضطراب و توہمات اور حیرت و استعجاب کی تاریکیوں میں گم ہیں اور اُنھوں نے معلوم کو مجہول اور ثابت کو معدوم بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اِن تاریکیوں سے نکلنے کے لیے اولاً، اُس چیز کو سمجھا جائے جو تمام علم و حکمت کی بنیاد ہے اور ہمارا یقین اُس سے فطری اور اضطراری طور پر متعلق ہوتا ہے یا ثانیاً، استدلال کے فطری طریقے کو سمجھا جائے جسے منطق نے ترک کر رکھا ہے۔ تمام علوم کے دروازے اِسی سے کھلیں گے اور ہم ایک ایسی میزان دریافت کر لیں گے جسے میزان حکمت کہنا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

---

* یعنی ارسطو جس نے جدلی دلائل (Dilectical Arguments) کے نام سے اِس کو ایک باقاعدہ فن کی صورت دی۔ ''اورجانون'' کے مباحث کو اُس کے قدیم مترجمین ایساغوجی (Categories)، انولوطیقا (analytics) اور طوبیقا (topics) کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ابتدا تھی، اِس فن کے جو خط و خال بعد میں متعین ہوئے، اُن کے لیے یہ اسکندر افرودیسی کی اُن کاوشوں کا مرہون منت ہے جو اُس نے ''اورجانون'' کی شرح و وضاحت کے لیے انجام دی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الاعراف

(۱۰)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ م بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

(اے[۵۶۳] پیغمبر، اِنھیں وہ وقت بھی یاد دلاؤ)، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں[۵۶۴] سے اُن

۵۶۳؎ زمین پر خدا کی دینونت کے واقعات سے استدلال کے بعد اب یہ قریش کو اُس عہد فطرت کی یاددہانی کرائی ہے جس کی بنیاد پر تمام بنی آدم قیامت کے دن مسئول ٹھیرائے جائیں گے اور خدا کی بارگاہ میں کوئی شخص یہ عذر پیش نہیں کر سکے گا کہ اُسے کسی پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی یا اُس نے شرک اور الحاد کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور خدا کے اقرار اور اُس کی توحید کے تصور تک پہنچنا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ قرآن نے اِس عہد کو جس طریقے سے پیش کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ محض تمثیلی انداز بیان نہیں ہے، بلکہ اُسی طرح کے ایک واقعے کا بیان ہے جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو جاتی ہے کہ خالق کا اقرار مخلوقات کی فطرت ہے۔ وہ اپنے وجود ہی سے تقاضا کرتی ہیں کہ خالق کی محتاج ہیں۔ اُن کے لیے خالق کا اثبات پیش نظر ہو تو کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف متنبہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسان بعض اوقات انکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ محض مکابرت ہے، لہٰذا جس وقت انکار کرتا ہے، عین اُسی وقت اپنے دائرۂ علم میں ہر انفعال کے لیے فاعل، ہر ارادے کے لیے مرید، ہر صفت کے لیے موصوف، ہر اثر کے

اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی شَہِدۡنَا اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ ہٰذَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۷۲﴾
اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ کُنَّا ذُرِّیَّۃً مِّنۡۢ بَعۡدِہِمۡ اَفَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ
الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾ وَ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ وَ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۷۴﴾

کی نسل کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ ٹھیرایا تھا۔ (اُس نے پوچھا تھا): کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں، (آپ ہی ہمارے رب ہیں)، ہم اِس کی گواہی دیتے ہیں[۵۶۵]۔ یہ (ہم نے) اِس لیے کیا کہ قیامت کے دن تم کہیں یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اِس بات سے بے خبر ہی رہے یا اپنا یہ عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر کیا آپ اِن غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟[۵۶۶] ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، (اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو[۵۶۷]) اور اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔۱۷۲-۱۷۴

لیے موثر اور ہر نظم کے لیے ایک علیم وحکیم ناظم کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔ اُس کا تمام علم اِسی سرگردانی کی سرگذشت ہے۔ یہ عمل کی تکذیب ہے جو اُس کے انکار کی حقیقت بالکل آخری درجے میں واضح کر دیتی ہے۔

۵۶۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ'۔ 'مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ'، 'مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ' سے بدل واقع ہوا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ واقعہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے، بلکہ قیامت کے دن تک جتنے بنی آدم بھی پیدا ہونے والے ہیں، اُن سب سے متعلق ہے اور ارواح کے اجسام کے ساتھ اتصال کی ابتدا سے پہلے ہوا ہے۔

۵۶۵؎ انسان کو اِس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اِس لیے یہ واقعہ تو اُس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اِس کی حقیقت اُس کے صفحۂ قلب پر نقش اور اُس کے نہاں خانۂ دماغ میں پیوست ہے۔ اِسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اُسے یاد دلایا جائے تو وہ اِس کی طرف اِس طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے، دراں حالیکہ اُس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، اور اِس یقین کے ساتھ لپکتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اُس کو جانتا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا یہ اقرار اُس کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب تھا جو اُس کے اندر ہی موجود تھا۔ اُس نے اِسے پا لیا ہے تو اُس کی نفسیات

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ الَّذِيۡۤ اٰتَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانۡسَلَخَ مِنۡهَا فَاَتۡبَعَهُ الشَّيۡطٰنُ فَكَانَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخۡلَدَ اِلَى الۡاَرۡضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ‌ ۚ فَمَثَلُهٗ

اور اُس کی سرگذشت بھی اِنھیں سناؤ[۵۶۸] جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائی تھیں، مگر وہ اُن سے نکل بھاگا[۵۶۹]۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا[۵۷۰]، یہاں تک کہ وہ گمراہوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اِن آیتوں کے ذریعے سے اُسے بلندی عطا کرتے[۵۷۱]، لیکن وہ زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کے تمام تقاضوں نے بھی اِس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پا لی ہے۔

۵۶۶؎ یعنی جہاں تک توحید اور بدیہیات فطرت کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں مجرد اِس اقرار کی بنا پر بنی آدم کا مواخذہ کیا جائے گا۔ اُن سے انحراف کے لیے کسی کا یہ عذر خدا کے ہاں مسموع نہیں ہو گا کہ اُسے کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی یا اُس نے یہ انحراف خارجی اثرات کے نتیجے میں اختیار کیا تھا اور اِس کے ذمہ دار اُس کے باپ دادا اور اُس کا ماحول ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ ہر شخص مجرد اِس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور میں جواب دہ ہے۔

۵۶۷؎ یعنی مزید حجت جس کے نتیجے میں دنیا میں بھی اُن کا مواخذہ ہو گا اور آخرت کے لحاظ سے بھی اُن کی مسئولیت دوچند ہو جائے گی، ورنہ اصلاً تو یہ حجت، جیسا کہ بیان ہوا، اُس علم سے قائم ہو جاتی ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ آیات الٰہی کی تفصیل سے اِسی علم کی یاددہانی ہوتی ہے۔ قرآن مجید اِسی بنا پر اپنے لیے 'ذِکۡر' اور 'ذِکۡرٰی' اور رسولوں کے لیے 'مُذَکِّر' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

۵۶۸؎ یہ من حیث القوم یہود کی تمثیل ہے۔ آگے یہ بات قرآن نے خود واضح کر دی ہے۔ لیکن آیت میں چونکہ لفظ 'الَّذِیۡ' آیا ہے، اِس لیے مختلف اشخاص کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''الَّذِیۡ' اگرچہ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے، لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اِس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو، بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے، اُس کو نگاہ میں رکھ کر اُس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اُس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعے کی تصویر کشی ہوتی ہے، اِس وجہ سے تقاضاے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اُس کو نکرہ کے بجاے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تا کہ تمثیل ایک خاص

كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَاِ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِاللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ

کی پیروی کرنے لگا۔ چنانچہ اُس کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ تم اُس پر (پتھر) اٹھاؤ، جب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور چھوڑ دو، جب بھی زبان نکالے رہتا ہے[۵۷۲]۔ یہ اُس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا۔ سو یہ سرگذشت (اِنھیں) سناؤ تاکہ یہ سوچیں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے اُس قوم کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرتی رہی[۵۷۳]۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جن کو اللہ ہدایت

شخص کی صورت میں متمثل ہوکر اِس طرح سامع کے سامنے آجائے کہ گویا اُس نے اُس کی سرگذشت صرف سنی ہی نہیں، بلکہ خود اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۹۵)

۵۶۹۔ یعنی کتاب الٰہی کی جو تشریف و خلعت اُنھیں عطا فرمائی گئی تھی، وہ اُنھوں نے اتار پھینکی اور استاذ امام کے الفاظ میں بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

۵۷۰۔ یہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوا جو سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں بیان ہوئی ہے کہ جو خداے رحمٰن کی یاددہانی سے منہ پھیرتے ہیں، اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے، پھر وہ اُسی کے ساتھی بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

۵۷۱۔ یعنی اُس قانون کے مطابق چاہتے جو ہم نے اُن لوگوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے جنھیں ہم اپنی آیتوں سے نوازتے ہیں۔ وہ قانون یہ ہے کہ اگر اِن آیتوں کی قدر کریں گے تو اِن کے ذریعے سے اُنھیں دین و دنیا کی سرفرازی حاصل ہوگی اور اِن سے گریز کر کے اپنی خواہشوں کے غلام ہوکر رہ جائیں گے تو اُنھی کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

۵۷۲۔ یعنی زبان نکالے ہوئے حرص و دناءت کی تصویر بنا رہتا ہے۔ اُسے پیار کیجیے یا دھتکاریے، اُس کی یہ حالت کسی حال میں اُس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہم اپنی زبان میں بھی اُس شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو، اِسی رعایت سے دنیا کا کتا کہتے ہیں۔

۵۷۳۔ اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ تمثیل کسی خاص شخص کی تمثیل نہیں ہے، بلکہ اُس قوم کی تمثیل ہے جس

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٧٨﴾
وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا
وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ
بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٧٩﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ

بخشے، وہی ہدایت پانے والے ہیں اور جن کو وہ (اپنے قانون کے مطابق) گمراہ کر دے، وہی نامراد ہوتے ہیں۔[574] ۱۷۵-۱۷۸

(یہ متنبہ ہو جائیں)، جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔[575] اُن کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ہیں۔ اُن کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں ہیں۔ اُن کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں ہیں۔[576] وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ وہی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نے اللہ کی آیتوں سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اُنھیں جھٹلا دیا۔ قرآن کے طالب علم جانتے ہیں کہ اِس سے مراد یہودی ہو سکتے ہیں۔

۵۷۴؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قریش کے لیے تہدید و وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں خدا کا ایک قانون ہے۔ اِس کے تحت ہدایت اُنھی کو ملتی ہے جو اُس کے سچے طالب ہوتے ہیں اور جو خواہشوں کی غلامی اختیار کر لیتے ہیں، وہ گمراہی کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اُنھیں کبھی راہ ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ اِس لیے ہر شخص پر واضح ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اِسی قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔

۵۷۵؎ یہ سخت غصے اور تہدید کا جملہ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جنوں اور انسانوں کی اکثریت نے سرکشی کا جو رویہ اختیار کیا ہے، اُس کے بعد تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اُنھیں پیدا ہی جہنم کے لیے کیا تھا۔ چنانچہ آگے وضاحت کر دی ہے کہ وہ کیوں جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔ فرمایا ہے کہ حقائق کو سمجھنے اور اُن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے جو صلاحیتیں ہم نے اُنھیں دی تھیں، اُن سے اُنھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی پیدایش کا مقصد ہی یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ پیدا ہوں، زندگی گزاریں اور جہنم رسید ہو جائیں۔

۵۷۶؎ یہ سمجھنا، دیکھنا اور سننا اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے، ورنہ مطلوبات بطن و فرج کے لیے تو وہ ہر چیز کو

بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

ہیں جو بالکل غافل ہیں[۵۷۷]۔ (ایمان والو، تم یاد رکھو کہ) اللہ کے لیے صرف اچھے نام ہیں، سو اُس کو اُنھی سے پکارو[۵۷۸] اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو جو اُس کے ناموں میں کج روی اختیار کر رہے ہیں[۵۷۹]۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اُس کا بدلہ عنقریب پا لیں گے۔ (یاد رکھو کہ سب یکساں نہیں ہیں)، ہمارے پیدا کیے ہوئے لوگوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اُسی کے مطابق فیصلے کرتا رہا ہے۔ (اِس کے برخلاف) جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے، اُن کو ہم وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں، جہاں سے اُن کو خبر بھی نہ ہوگی۔ (اِس وقت) میں اُن کو ڈھیل دے رہا ہوں، اِس لیے کہ

خوب سمجھتے، دیکھتے اور سنتے ہیں۔

۵۷۷؎ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...چوپایوں کے مانند اِس وجہ سے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب وجستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے، اِسی طرح اُن کی تگ ودو بھی اپنی مادی ضروریات وخواہشات ہی تک محدود ہے۔ اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اِس وجہ سے ہیں کہ چوپائے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اِس میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں، اُن سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ بسا اوقات اُس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل یا گدھے سے کبھی صادر نہیں ہوتیں۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں، پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے، لیکن ایک گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اصلی اور حقیقی بے خبر ہیں، اِس لیے کہ یہ بے خبری چوپایوں میں بھی نہیں ہے۔“ (تدبرقرآن ۳/ ۳۹۸)

۵۷۸؎ یعنی ایسے ناموں سے پکارو جو اُس کی شان یکتائی، اُس کی قدرت، اُس کی بے نیازی اور اُس کے علم و حکمت کے مطابق ہیں۔ یہ اُسی توحید کی وضاحت مزید ہے جس کا ذکر او پر عہد فطرت کے حوالے سے ہوا ہے۔

۵۷۹؎ اصل میں لفظ 'يُلْحِدُوْنَ' آیا ہے۔ یہ یہاں صفات الٰہی کی بے حرمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا مَا بِصَاحِبِھِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ ھُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا

میری تدبیر بڑی محکم ہے[۵۸۰]۔۱۷۹-۱۸۳

کیا اِنھوں نے غور نہیں کیا کہ اِن کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے[۵۸۱]؟ وہ تو ایک کھلا خبردار کرنے والا

مطلب یہ ہے کہ ایسے نام اور ایسی صفات اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتے ہیں جو کسی طرح اُس کے شایان شان نہیں ہے، جن سے اُس کی ذات وصفات کی اہانت ہوتی ہے اور جن سے وہ پاک، برتر اور منزہ ہے۔

۵۸۰؎ یہ معاملہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو خدا کے مقابلے میں سرکشی اور بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے۔ مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اُس نے بازی مار لی، حالاں کہ شکاری اِس لیے اُس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے، لیکن وہ اُس کے قابو سے باہر نہیں جا سکتی۔ اُس کی بھاگ دوڑ اُس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی، بلکہ اُس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود گھسٹتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔ اُس کی تدبیر نہایت محکم اور اُس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اُس کے احاطے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اِس وجہ سے وہ لوگوں کو اُن کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اِس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، حالاں کہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں، اتنے ہی اپنی ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو، اُس کو جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟“ (تدبر قرآن ۳/ ۴۰۰)

۵۸۱؎ ساتھی سے مراد یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کو جو دن رات اِس بات کی لگن تھی کہ آپ اپنی قوم کو اُس عذاب سے خبردار کر دیں جو سنت الٰہی کے مطابق رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر لازماً آتا ہے، اُسے دیکھ کر قریش کے لیڈر اپنے لوگوں کو آپ کے اثر سے بچانے اور اپنی سیادت کی دھاک قائم رکھنے کے لیے اُن سے کہتے تھے کہ اگرچہ یہ شخص بھلا چنگا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اِسے عذاب اور قیامت کا سودا لاحق ہو گیا ہے۔ یہ قریش کی اِسی طفل تسلی کی تردید فرمائی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ساتھی کا لفظ بھی اِسی بنا پر استعمال کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ
قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا
هَادِیَ لَهٗ وَیَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ

ہے۔کیا اِنھوں نے زمین و آسمان کی سلطنت پر اور اُن چیزوں پر جو خدا نے پیدا کی ہیں، کبھی نگاہ نہیں کی (کہ اِن پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ خدا نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا) اور نہیں سوچا کہ کیا عجب اِن کی مدت قریب آ لگی ہو؟[۵۸۲] سو (یہ مدت پوری ہو گئی تو) اِس کے بعد یہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ (حقیقت یہ ہے کہ) جنھیں خدا (اپنے قانون کے مطابق) گمراہی میں ڈال دے، اُن کے لیے پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہو سکتا۔ اُن کو وہ اُن کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ (تمھارے

’’...اِس لفظ کے استعمال سے قریش کو اِس امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ پیغمبر اُن کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں، بلکہ اُن کے دن رات کے ساتھی ہیں۔ اِن کا بچپن، اِن کی جوانی، سب اُنھی کے اندر اور اُنھی کے ساتھ گزری ہے۔ ہر دور اور ہر مرحلہ میں اُنھوں نے اِن کو دیکھا اور آزمایا اور ہر طرح کے حالات میں اِن کو جانچا اور پرکھا ہے۔ پھر آخر یہ اِس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاک بازی، اپنی فکر و رائے کی اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں گل سرسبد رہا دفعتاً وہ اب خبطی اور دیوانہ کیسے بن گیا؟‘‘ (تدبر قرآن ۳/ ۴۰۰)

۵۸۲؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کی کائنات پر غور کرتے تو لازماً اِس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ نہ یہ کارخانہ عبث بنا ہے کہ جزا و سزا کے بغیر یوں ہی چلتا رہے اور کسی ظالم، معاند، حق و انصاف کے دشمن اور سرکش کے لیے کوئی یوم حساب نہ آئے اور نہ اِس کا علیم و حکیم خداوند جس نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز کا شعور دیا ہے، خود اِس شعور سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یوں ہی چھوڑے رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ حسرت و افسوس کے ساتھ فرمایا ہے کہ وہ اِس بات پر غور کرتے تو یہ بات بھی اُن پر کھل جاتی کہ کیا عجب کہ اُن کی وہ اجل بھی قریب آ لگی ہو جس سے پیغمبر اُن کو خبردار کر رہے ہیں اور خدا کا وہ فیصلہ اُن کے لیے بھی صادر ہونے والا ہے جو اُن سے پہلے پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے صادر ہو چکا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...یہ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں آفاقی شہادت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہہ رہے ہیں، اُس کو

مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَةً یَسْئَلُوْنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ
اللّٰهِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا

استہزا کے لیے) وہ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ آخر وہ گھڑی کب نازل ہوگی؟[۵۸۳] کہہ دو کہ اُس کا علم تو میرے پروردگار ہی کے پاس ہے۔ وہی اپنے وقت پر اُس کو ظاہر کرے گا۔[۵۸۴] زمین و آسمان اُس سے بوجھل ہو رہے ہیں۔[۵۸۵] وہ تم پر اچانک آ پڑے گی۔ وہ (اُس کے بارے میں) تم سے اِس طرح پوچھتے ہیں گویا تم اُس کی تحقیق میں لگے ہوئے ہو۔[۵۸۶] کہہ دو: اُس کا علم تو صرف خدا کو ہے، مگر

خبط پر محمول نہ کرو، بلکہ اپنی بلادت اور سرگشتگی پر ماتم کرو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۰۳)

۵۸۳؎ اصل میں 'اَیَّانَ مُرْسٰهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَیَّانَ' بھی 'متی' کے معنی میں ہے، لیکن یہ اُس موقع پر استعمال ہوتا ہے، جب استغراب واستنکار کے لہجے میں کسی چیز کے متعلق پوچھنا مقصود ہو۔ اِسی طرح 'مُرْسٰی' جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں۔ اِس سے سوال کے اندر چھپے ہوئے طنز واستہزا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں گویا مدعا یہ ہے کہ جس گھڑی کے ڈراوے سنا رہے ہو، وہ کب نمودار ہوگی؟ آخر یہ جہاز چلا تو کہاں اٹک کر رہ گیا، یہ ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا؟

۵۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ اُس کا علم بھی خدا ہی کے پاس ہے اور اُس کو برپا کر دینے کی قدرت بھی وہی رکھتا ہے۔ مجھے نہ اُس کے وقت کا پتا ہے اور نہ میں یہ طاقت رکھتا ہوں کہ جب چاہوں، اُسے برپا کر دوں۔

۵۸۵؎ اِس سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...جس طرح ایک حاملہ عورت ولادت کے قریب بارِ حمل سے گراں بار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے، لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی، وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان و زمین میں غور کرنے والے اربابِ بصیرت کا ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کو اِس بوجھ سے گراں بار دیکھتے ہیں، اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اِس بوجھ سے کب سبک دوش ہوں گے، لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبک دوش ہونے کے لیے منتظر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان و زمین کے اندر نمایاں ہے۔ اِس میں اِس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

لوگوں کی اکثریت (اِس بات کو) نہیں جانتی۔ کہہ دو: (تم مجھ سے اُن چیزوں کا مطالبہ نہ کرو جو خدا کے علم و اختیار میں ہیں)، میں اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ مجھے سارے غیب کا علم ہوتا تو میں خیر کثیر جمع کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔[۵۸۷] (حقیقت یہ ہے کہ) میں صرف ایک خبردار کرنے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۱۸۴-۱۸۸

ہے کہ جن لوگوں کو آسمان و زمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آ رہی ہیں، اُن کو گویا آخری مرحلے میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آ رہا ہے۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۴۰۴)

۵۸۶؎ حالاں کہ کوئی شخص بھی جسے خدا نے علم و عقل سے بہرہ یاب کیا ہو، کسی ایسی چیز کے درپے نہیں ہو سکتا جو اُس کے حدود علم و تحقیق سے ماورا ہو۔ اور اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے، اِس لیے کہ اِس سے بڑھ کر بے عقلی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جاننے کی چیزوں پر توجہ کرنے کے بجائے اُن چیزوں کی کھوج کرید میں لگا رہے جن کو نہ وہ جان سکتا ہے اور نہ وہ اُس کے جاننے کی ہیں۔

۵۸۷؎ یعنی علم و عمل کا سارا خزانہ سمیٹ لیتا، لیکن تم جانتے ہو کہ مجھے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے اور اپنے لیے خیر و صلاح کے راستوں پر بھی میں اُسی حد تک آگے بڑھ سکتا ہوں جس حد کا مجھے علم دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...'لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ' کے ٹکڑے میں جس خیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کر لینے کی تمنا کا اظہار ہے، وہ پیغمبر کے ظرف اور اُس کی طلب کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر اپنے حوصلہ اور اپنے ارمان کے اعتبار سے اِس مقام بلند پر ہوتا ہے کہ وہ خیر کی کسی وادی کو ناطے کردہ نہیں چھوڑنا چاہتا، لیکن وہ خیر سے واقف اُسی حد تک ہوتا ہے، جس حد تک اُس کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اُس کو پورا غیب معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کے اپنے امکان کے حد تک تو اُس کی کوشش یہی ہو گی کہ خیر کی راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ لیکن دائرۂ وحی سے باہر اُسے بھی دوسروں کی طرح اپنی صواب دید ہی پر کام کرنا اور اپنی عقل ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی، دونوں کے امکانات مضمر ہوتے ہیں۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۴۰۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

هُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا
فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا
لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ
شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ
شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَآ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ اُس سے تسکین پائے۔[۵۸۸] پھر (بارہا ایسا ہوا کہ) جب مرد نے عورت کو چھا لیا تو اُسے ایک ہلکا سا حمل رہ گیا۔ سو اُس کو لیے پھرتی رہی۔ پھر جب زیادہ بوجھل ہو گئی تو مرد و عورت، دونوں نے مل کر اللہ، اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (پروردگار)، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد عطا فرمائی تو ہم تیرے شکر گزاروں میں رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اُن کو صحیح و سالم اولاد عطا فرما دی تو اُس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ دوسروں کو شریک ٹھیرانے لگے۔[۵۸۹] (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ برتر ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔[۵۹۰] کیا وہ اُن کو شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ نہ

۵۸۸؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا یہ نہیں کر سکتا تھا کہ دو الگ الگ اور مستقل وجود پیدا کرے اور دونوں میں ایسی مطابقت، ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کر دے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے راحت دل و جان اور سرمایۂ تسکین و نشاط بن جائیں۔ یہ اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایک ہی علیم و حکیم ہستی کا ارادہ ہے جس نے اپنے پیشگی منصوبے کے تحت، دونوں کو خاص ڈھنگ سے وجود بخشا اور اِس طرح پروان چڑھایا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بمنزلۂ جان و تن ہو گئے ہیں۔ آیت میں ایک جان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

۵۸۹؎ یہ مشرکین کا عام رویہ ہے۔ اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو وہ اللہ، پروردگار عالم ہی کی طرف متوجہ ہوتے اور اُسی کو پکارتے ہیں، لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اُسے دوسروں کی کرامت اور اُن کے علم و عمل کا کرشمہ قرار دینے لگتے ہیں۔

وَاِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَی الۡهُدٰی لَا یَتَّبِعُوۡکُمۡ سَوَآءٌ عَلَیۡکُمۡ اَدَعَوۡتُمُوۡهُمۡ اَمۡ اَنۡتُمۡ
صَامِتُوۡنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡهُمۡ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا
لَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمۡ اَرۡجُلٌ یَّمۡشُوۡنَ بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ اَیۡدٍ یَّبۡطِشُوۡنَ
بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ اَعۡیُنٌ یُّبۡصِرُوۡنَ بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا قُلِ ادۡعُوۡا شُرَکَآءَکُمۡ

اُن کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم اُن کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھارے پیچھے نہ آئیں گے۔[۵۹۱] تم اُنھیں پکارو یا خاموش رہو، تمھارے لیے برابر ہے۔ تم اللہ کے سوا جنھیں پکارتے ہو، وہ بندے ہیں، جس طرح تم بندے ہو۔[۵۹۲] سو اُنھیں پکار دیکھو، اُنھیں چاہیے کہ تمھیں جواب دیں، اگر تم سچے ہو۔[۵۹۳] (تم نے کبھی غور نہیں کیا)، کیا اُن کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں؟ کیا اُن کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں؟ کیا اُن کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں؟ کیا اُن کے کان

۵۹۰؎ شرک جس نوعیت کا بھی ہو، اُس سے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال کی نفی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ وہ ایسی تمام نسبتوں اور شراکتوں سے منزہ اور ارفع ہے، اِس نوعیت کی کوئی چیز بھی اُس سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔

۵۹۱؎ اصل میں لفظ 'لَا یَتَّبِعُوۡکُمۡ' آیا ہے۔ لفظ 'اِتِّبَاع' یہاں اپنے ابتدائی لغوی مفہوم میں ہے، یعنی 'مشی خلفه'۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ اُس نے مصیبت میں بلایا، لیکن کوئی اُس کے پیچھے نہیں آیا۔

۵۹۲؎ یہ اُن ذوات پر تبصرہ ہے جنھیں مشرکین اپنے زعم کے مطابق خدائی میں شریک مانتے اور معبود قرار دے کر پوجتے تھے، یعنی فرشتے اور جنات وغیرہ۔

۵۹۳؎ یہ اُسی طرح کا چیلنج ہے، جس طرح کا چیلنج سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۳ میں دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہوا کہ اب تک تو تم نے اپنے اِن خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا، لیکن اب پیغمبر اور قرآن نے اِن سب کی خدائی کو چیلنج کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمھاری مدد اور رہنمائی کے لیے پہنچیں اور تم کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی سنبھالیں۔ اگر اُنھوں نے اپنی خدائی بچا لی تو بے شک، معلوم ہوگا کہ تم سچے ہو۔“

(تدبر قرآن ۳/ ۴۰۹)

ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ

ہیں جن سے وہ سنتے ہیں[۵۹۴]؟ کہہ دو (اے پیغمبر)، تم اپنے سب شریکوں کو بلالو، پھر میرے خلاف تدبیریں کر دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو[۵۹۵]۔ میرا کارساز اللہ ہے جس نے نہایت اہتمام کے ساتھ یہ کتاب اتاری ہے اور وہ اپنے نیک بندوں کی کارسازی فرماتا ہے[۵۹۶]۔ (اِس کے برخلاف) جنھیں تم اللہ کے سوا

۵۹۴؎ اوپر ذوات پر تبصرہ کیا تھا۔ اب یہ اُن مظاہر پر تنقید ہے جنھیں مشرکین اِن ذوات کے پیکر اور قالب کی حیثیت سے سونے، چاندی یا لوہے اور پتھر کی مورتوں کی صورت میں ڈھالتے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ اُن کے یہ معبود اِن مورتوں کے اندر حلول کر آئے ہیں۔ زبور میں یہی حقیقت بدیں الفاظ بیان ہوئی ہے:

اُن کے بت چاندی اور سونا ہیں
یعنی آدمی کی دست کاری۔
اُن کے منہ ہیں، پر وہ بولتے نہیں۔
آنکھیں ہیں، پر وہ دیکھتے نہیں۔
اُن کے کان ہیں، پر وہ سنتے نہیں۔
ناک ہیں، پر وہ سونگھتے نہیں۔
اُن کے ہاتھ ہیں، پر وہ چھوتے نہیں۔
پاؤں ہیں، پر وہ چلتے نہیں۔
اور اُن کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔
اُن کے بنانے والے اُنھی کے مانند ہو جائیں گے۔
بلکہ وہ سب جو اُن پر بھروسا رکھتے ہیں۔

(۱۱۵: ۴-۸)

۵۹۵؎ یہ اُن دھمکیوں کا جواب ہے جو مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے کہ ہمارے معبودوں کو برا کہتے ہو اور اُن کی طرف سے لوگوں کے عقیدے خراب کر رہے ہو تو یاد رکھو، ایک دن اُن کا قہر تم پر ٹوٹ پڑے گا اور تم کہیں پناہ حاصل نہ کر سکو گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يَنۡصُرُوۡنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى لَا يَسۡمَعُوۡا وَتَرٰهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ
وَهُمۡ لَا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۱۹۹﴾
وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ
اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۰۱﴾ وَاِخۡوَانُهُمۡ

پکارتے ہو، وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ تم اُنھیں رہنمائی کے لیے پکارو تو تمھاری بات نہ سنیں گے۔ تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں، مگر (حقیقت یہ ہے کہ) وہ کچھ نہیں دیکھتے۔[597] (اِن کے ماننے والوں کو اب اور کیا سمجھایا جائے؟ اِس لیے) درگذر کرو (اے پیغمبر)، نیکی کی تلقین کرتے رہو[598] اور اِن جاہلوں سے اعراض کرو۔ (اِس کے باوجود) اگر تمھیں کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آ جائے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (یاد رکھو)، جو خدا ترس ہیں، اُنھیں جب شیطان کی کوئی چھوت لاحق ہوتی ہے تو فوراً (اپنے پروردگار کا)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۵۹۶؎ مطلب یہ ہے کہ تمھارے معبود تو اپنے چہرے سے مکھی بھی نہیں ہٹا سکتے، لیکن میرا حامی و ناصر وہ پروردگار ہے جس نے انسان کی حیثیت سے میری سب سے بڑی احتیاج پوری کی اور مجھے کتاب ہدایت سے نوازا ہے۔ اُس کی شان یہی ہے کہ وہ اپنے صالح بندوں کی کارسازی فرماتا ہے۔

۵۹۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَتَرٰهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ، وَهُمۡ لَا يُبۡصِرُوۡنَ'۔ اِن میں 'تَرٰهُمۡ' اگرچہ واحد ہے، لیکن یہ 'خطاب لغیر معین' کے اسلوب پر آیا ہے، لہٰذا جمع کے مفہوم میں ہے اور اِس کے مخاطب مشرکین ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں 'رویت'، 'نظر' اور 'ابصار' کے الفاظ اِس ٹکڑے میں اِس خوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بس قرآن کا اعجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے بصرو، تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ تمھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں، لیکن اِنھیں سوجھتا سجھاتا کچھ بھی نہیں۔

۵۹۸؎ اصل میں لفظ 'عُرۡف' آیا ہے۔ اِس سے مراد وہ باتیں ہیں جو تمام سلیم الطبع لوگوں کے نزدیک نیکی اور خیر کی باتیں سمجھی جاتی ہیں اور اِس لحاظ سے گویا جانی پہچانی ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ جو دعوت دے رہے ہو، اُس پر جمے رہو۔ خدا کا فیصلہ جب تک صادر نہیں ہو جاتا، تمھارے لیے یہی حکم ہے۔ اِن کی بوالفضولیوں کے پیش نظر تم خیر و

يَمُدُّوۡنَهُمۡ فِى الۡغَىِّ ثُمَّ لَا يُقۡصِرُوۡنَ ﴿۲۰۲﴾
وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بِاٰيَةٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ مِنۡ رَّبِّىۡ
هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾ وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ

دھیان کرتے ہیں اور دفعتاً اُن کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ (اِس کے برخلاف) اِن (جاہلوں) کے بھائی، (شیاطین) اِنھیں گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر (اُس میں) کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔۱۸۹-۲۰۲

(اِن کے مطالبے پر) تم اِن لوگوں کے سامنے جب کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو کہتے ہیں کہ تم نے (اپنے لیے) کوئی نشانی کیوں نہیں گھڑ لی؟[۵۹۹] کہہ دو: میں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ اُن لوگوں کے لیے تمھارے پروردگار کی طرف سے آنکھیں کھول دینے والی آیتیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لائیں۔[۶۰۰] (اِس

صلاح کی یہ دعوت منقطع نہیں کر سکتے۔

۵۹۹؎ یہ صریح طعن کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن گھڑ کر لا سکتے ہو تو اپنے دعویٰ نبوت کی تائید کے لیے کوئی معجزہ بھی گھڑ کر لے آؤ۔ اِس مفہوم کے لیے اصل میں لفظ 'اِجْتِبَاء' آیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی تو کسی چیز کا انتخاب کر لینے کے ہیں، مگر طنزیہ اسلوب نے یہاں اِس میں گھڑنے اور بنا لینے کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس قول سے ظالموں کا مطلب یہ ہوتا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اُس کا معاملہ تو بہت آسان ہے۔ اِدھر اُدھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور کاہنوں اور اہل کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں، اُن میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں، اُن کو جوڑ جاڑ کر کچھ کلام بنایا اور اُس کو لا کر ہمیں اِس دعوے کے ساتھ سنا دیا کہ یہ اللہ نے اپنے خاص فرشتے کے ذریعے سے وحی بھیجی ہے۔ لیکن اب ہم نے مطالبہ جو معجزے کا رکھ دیا ہے تو تمھاری کچھ پیش نہیں جاتی، اِس لیے کہ اِدھر اُدھر سے باتیں چھانٹ لینا اور چیز ہے، معجزہ دکھانا اور چیز ہے۔ یہ چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ کر لاتے اور ہمیں دکھا دیتے کہ یہ لو، تمھارا مطالبہ پورا کر دیا۔ گویا اِس طعنے میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے ہی کا طعنہ نہیں، بلکہ اِس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اِس کے اندر یہ مضمر ہے کہ نعوذ باللہ قرآن ایک من گھڑت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾
وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ فِىۡ نَفۡسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيۡفَةً وَّدُوۡنَ الۡجَـهۡرِ مِنَ الۡقَوۡلِ بِالۡغُدُوِّ
وَالۡاٰصَالِ وَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡغٰفِلِيۡنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ

لیے) جب قرآن سنایا جائے تو اُس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔۲۰۳-۲۰۴
اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو (اے پیغمبر)، دل ہی دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور ہلکی آواز سے اور اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں[۶۰۱]۔ حقیقت یہ ہے کہ جو (فرشتے)

چیز ہے جو اِدھر اُدھر سے اپنے ذوق کے مطابق چھانٹی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۱۲)

۶۰۰؎ یعنی آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ یہ اُس طنز کا جواب ہے جو اوپر نقل ہوئی ہے اور دیکھیے کہ کس قدر باعظمت اسلوب میں اور کیسا باوقار جواب ہے۔ فرمایا تھا کہ نیکی کی تلقین کرتے رہو اور اِن جاہلوں سے اعراض کرو۔ یہ بہترین مثال ہے کہ اِس ہدایت کی تعمیل کس طرح ہونی چاہیے۔ اُن کی بات چونکہ آخری درجے میں جاہلانہ تھی، اِس لیے اُس کا نوٹس ہی نہیں لیا اور اصل حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں سامنے رکھ دی ہے کہ میں معجزے اور کرامتیں نہیں، بلکہ یہ بصائر اور ہدایت و رحمت لے کر آیا ہوں، اِس لیے قبول کرنا ہے تو اِسے قبول کرو۔ دنیا اور آخرت کی تمام سعادتیں اِسی میں مضمر ہیں۔ لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ دلوں کی خرابی دور کی جائے اور جانتے ہو، وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ تم حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

۶۰۱؎ یہ آخر میں خدا کو دائماً یاد رکھنے کی تلقین فرمائی اور اُس کا طریقہ بھی بتا دیا ہے کہ خدا کا یہ ذکر ناز و تدلل کے ساتھ نہیں، بلکہ لجاجت، خوف، فروتنی اور مسکنت کے ساتھ اور پست آواز سے ہونا چاہیے تاکہ دل کی توجہ اِس میں شامل رہے۔ روح کی زندگی کے لیے یہ اُسی طرح ضروری ہے، جس طرح جسم کی زندگی کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے۔ شیطان کے حملوں سے یہی ذکر آدمی کو بچاتا اور دعوت حق کے راستے پر پابرجا رکھتا ہے۔ قرآن کی اکثر سورتیں اِسی تلقین پر ختم ہوتی ہیں، اِس لیے کہ دعوت کی راہ میں یہی بدرقہ ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو بیدار کرنے والے کہیں خود غفلت کی نیند نہ سو جائیں اور جس بھول سے وہ دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں، وہی بھول کہیں اُنھیں بھی لاحق نہ ہو جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ﴿۲۰۶﴾

تیرے پروردگار کے حضور میں ہیں، وہ اُس کی عبادت سے کبھی تکبر نہیں کرتے۔ وہ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور اُسی کے آگے سجدہ ریز رہتے ہیں۔[۶۰۲] ۲۰۵-۲۰۶

۶۰۲؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کو یاد کرنے والوں کا زمرہ یہ ہے۔ وہ زمین پر رہتے بستے ہیں، مگر اُن کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہوتا ہے جو اپنے پروردگار کی بندگی سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے مانتے ہیں کہ اُن کا خالق بے عیب، بے نقص اور بے خطا ہے، ہر قسم کی کمزوریوں سے منزہ ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، وہ بے ہمتا اور بے مثل ہے۔ وہ زبان سے بھی دائماً اِسی حقیقت کا اعتراف و اعلان کرتے اور اُسی کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اِس میں مشرکین پر بھی تعریض ہے کہ جن کو خدا کے شریک ٹھیراتے ہو، اُن کا اپنا حال یہ ہے کہ ہر وقت خدا کے آگے سرگرم سجود اور زمزمہ سنج تسبیح و تہلیل ہیں۔

کوالالمپور

۲۸/ مارچ ۲۰۱۱ء

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد رفیع مفتی

خوردونوش

تعیین خبائث

(۱)

عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ کُلِّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَعَنْ کُلِّ ذِیْ مِخْلَبٍ مِنَ الطَّیْرِ. (مسلم، رقم ۴۹۹۴)

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کچلی والے درندے اور چنگال والے پرندے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

توضیح:

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہے۔

۱۔ ''ایمان والو، کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمھیں عطا کی ہیں اور اللہ ہی کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ اس نے تو بس تمھارے لیے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ٹھیرایا ہے۔''

(البقرہ ۲: ۱۷۲-۱۷۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔ ''کہہ دو: میں تو اس وحی میں جو میری طرف آئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز جسے وہ کھاتا ہے، حرام نہیں پاتا، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سؤر کا گوشت، اِس لیے کہ یہ سب ناپاک ہیں یا اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ کے سوا کسی اور کے نام کا ذبیحہ۔'' (الانعام ۶:۱۴۵)

درج بالا حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خورونوش کے حوالے سے قرآن کے بتائے ہوئے اصولِ طیبات و خبائث کا اطلاق کرتے ہوئے ہمیں یہ بتایا ہے کہ کچلی والے درندے اور چنگال والے پرندے خبائث میں سے ہیں، لہٰذا یہ ممنوع ہیں۔

(۲)

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو . . . أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ وَعَنِ الْجَلَّالَةِ وَعَنْ رُكُوْبِهَا وَعَنْ أَكْلِ لَحْمِهَا. (نسائی، رقم ۴۴۵۲)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت محمد بن عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے... کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور جلالہ سے، یعنی اس پر سواری کرنے اور اس کا گوشت کھانے سے بھی منع فرمایا۔

توضیح:

شریعت نے ہمارے لیے صرف طیبات ہی کو حلال ٹھیرایا ہے۔ یہ حدیث اس چیز کو واضح کرتی ہے کہ پالتو گدھا اور جلالہ طیبات میں سے نہیں، بلکہ یہ خبائث میں سے ہیں۔ جلالہ اس جانور کو کہتے ہیں، جسے گندگی کھانے کی عادت پڑ گئی ہو اور اس وجہ سے وہ بدبودار ہو گیا ہو۔ آپ نے جلالہ پر سواری کرنے سے بھی منع فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سوار ہونے کی حالت میں اس کا پسینہ سوار کے جسم کو لگتا ہے۔

حرمت متعہ اور تعیین خبائث

(۳)

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَعَنْ أَكْلِ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْإِنْسِيَّةِ.

(بخاری، رقم ۴۲۱۶۔ مسلم، رقم ۳۴۳۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں سے متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

توضیح:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردوں کے لیے عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا جائز راستہ کیا ہے؟ اِسے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اور تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمھارے لونڈی غلاموں میں سے جو صلاحیت رکھتے ہوں، ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں، انھیں چاہیے کہ عفت اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔"

(النور۲۴: ۳۲-۳۳)

ان آیات میں یہ بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز ہے، اور وہ نکاح ہے۔

نکاح ایک معروف چیز ہے۔ یہ علانیہ ایجاب و قبول کے ساتھ مرد و عورت کے درمیان مستقل رفاقت کا عہد ہے۔ نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ یہ زندگی بھر کے تعلق کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے، جبکہ متعہ محض ایک متعین مدت تک کے لیے ہوتا ہے اور یہ نکاح کی اصل فطرت ہی کے خلاف ہے۔

درج بالا حدیث ہمیں یہ بتاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن قرآن کی اس ہدایت کو سوسائٹی میں

نافذ کرتے ہوئے مرد و عورت کے درمیان متعہ کے تعلق کو ممنوع قرار دے دیا۔

پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے مناہی کی وجہ اس کا خبائث میں سے ہونا ہے، جیسا کہ پچھلی حدیث کے تحت بیان ہوا ہے۔

خون اور مردار کی حرمت میں استثنا

(۴)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ: أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ: اَلْجِرَادُ وَالْحِيتَانُ وَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ. (بیہقی، رقم ۱۱۲۸)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ ہمارے لیے دو مردار اور دو خون یعنی ٹڈی اور مچھلی اور جگر اور تلی حلال ٹھہرائے گئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

توضیح:

خور و نوش میں حلت و حرمت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ’’کہہ دو: میں تو اس وحی میں جو میری طرف آئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز جسے وہ کھاتا ہے، حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سؤر کا گوشت، اِس لیے کہ یہ سب ناپاک ہیں یا اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ کے سوا کسی اور کے نام کا ذبیحہ۔‘‘ (الانعام ۶: ۱۴۵)

اس آیت میں یہ واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردار اور خون، دونوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ درج بالا حدیث بتاتی ہے کہ دو مردار، یعنی ٹڈی اور مچھلی حرام نہیں ہیں اور اسی طرح دو خون، یعنی جگر اور تلی بھی حرام نہیں ہیں۔ ان دونوں میں دراصل کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں مردار اور خون کے الفاظ اپنے عرف عام کے مطابق بولے گئے ہیں اور حدیث میں ان الفاظ کے غلط اطلاق سے بچانے کے لیے انھیں ان کے عام اطلاق سے ہٹ کر بولا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مردہ مچھلی اور ٹڈی حرام نہیں ہیں، اگرچہ یہ مردہ ہی ہوتی ہیں اور نہ جگر اور تلی حرام ہیں، اگرچہ

یہ خون ہی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، کیونکہ عرف عام میں نہ مری ہوئی مچھلی اور ٹڈی کو مردار کہا جاتا ہے اور نہ جگر اور تلی کو خون کہا جاتا ہے۔

تعیین طیبات

(۵)

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ یَقُوْلُ: سَأَلَ رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّا نَرْكَبُ الْبَحْرَ وَنَحْمِلُ مَعَنَا الْقَلِیلَ مِنَ الْمَاءِ فَإِنْ تَوَضَّأْنَا بِهِ عَطِشْنَا أَفَنَتَوَضَّأُ مِنْ مَاءِ الْبَحْرِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ الْحِلُّ مَیْتَتُهُ. (نسائی، رقم ۵۹)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہم لوگ سمندر میں سفر کرتے ہیں اور ہمارے ساتھ تھوڑا سا ہی پانی ہوتا ہے، اگر ہم اس سے وضو کرنے لگ جائیں تو پھر پیاسے رہ جائیں گے، تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار بھی حلال ہے۔

توضیح:

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ واضح کیا ہے کہ سمندر کا پانی طیبات میں سے ہے۔ چنانچہ یہ پاک شمار ہوگا اور اس کا مردہ جانور بھی طیبات میں سے ہے۔ لہٰذا یہ بھی حلال تصور ہوگا۔

قرآن نے مردار کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ قرآن نے حرام چیزوں کو بیان کرتے ہوئے، مردار کا لفظ جس معنوں میں بولا ہے، اس کا اطلاق سمندر کے مردہ جانور پر نہیں ہوتا۔

جانور کا تذکیہ

(۶)

عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ إِنْ أَحَدُنَا أَصَابَ صَيْدًا وَلَيْسَ مَعَهُ سِكِّيْنٌ أَيَذْبَحُ بِالْمَرْوَةِ وَشِقَّةِ الْعَصَا؟ فَقَالَ أَمْرِرِ الدَّمَ بِمَا شِئْتَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ. (ابوداؤد، رقم ۲۸۲۴)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، آپ فرمائیں کہ اگر ہم میں سے کوئی اپنا شکار پالے اور اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ پتھر یا لکڑی کے ٹکڑے سے ذبح کرلے؟ آپ نے فرمایا: جس چیز سے چاہو، خون بہا دو اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لو۔

توضیح:

جانور کا تذکیہ کرنے میں اصل چیز یہ ہے کہ اس کا خون بہایا جائے اور اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ خون کس چیز سے بہایا گیا ہے۔

شکار سے متعلق فقہی مسائل

(۷)

عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ أَنَّهُ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الصَّيْدِ، فَقَالَ: إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ فَإِنْ أَدْرَكْتَهُ لَمْ يَقْتُلْ فَاذْبَحْ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنْ أَدْرَكْتَهُ قَدْ قَتَلَ وَلَمْ يَأْكُلْ فَكُلْ فَقَدْ أَمْسَكَهُ عَلَيْكَ، فَإِنْ وَجَدْتَّهُ قَدْ أَكَلَ مِنْهُ فَلَا تَطْعَمْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنَّمَا أَمْسَكَ عَلٰى نَفْسِهِ وَإِنْ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خَـالَطَ كَلْبُكَ كِلَابًا فَقَتَلْنَ فَلَمْ يَأْكُلْنَ فَلَا تَأْكُلْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنَّكَ لَا تَدْرِيْ أَيُّهَا قَتَلَ. (نسائی، رقم ۴۲۶۸)

حضرت عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکار کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: تم جب اپنا کتا چھوڑتے ہو تو اللہ کا نام لے کر چھوڑو۔ پھر اگر دیکھو کہ اس نے شکار کو (زندہ پکڑا ہے) مارا نہیں تو اسے اللہ کا نام لے کر ذبح کر لو اور اگر دیکھو کہ مار ڈالا ہے، مگر اس میں سے کچھ کھایا نہیں تو تم اسے کھا سکتے ہو، اِس لیے کہ یہ اس نے تمھارے لیے روک رکھا ہے۔ لیکن اگر کھا لیا ہو تو اسے کھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ پھر اس نے اپنے لیے روکا ہے اور اگر دوسرے کتے بھی اپنے کتے کے ساتھ اس طرح دیکھو کہ انھوں نے شکار کو مار دیا ہے اور اس کو کھایا نہیں تب بھی اسے نہ کھاؤ، اس لیے کہ تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کس نے مارا ہے۔

توضیح:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شکاری جانور کے ذریعے سے شکار کرنے والے کو درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ جب وہ شکار پر اپنا سدھایا ہوا جانور، مثلاً شکاری کتا وغیرہ چھوڑے تو اسے اللہ کا نام لے کر چھوڑے۔

۲۔ اگر وہ کتا اس جانور کو پکڑ لے، لیکن اسے مارے نہیں، تو اسے اللہ کا نام لے کر ذبح کرے اور کھائے۔

۳۔ اگر وہ جانور کو مار ڈالے اور اس میں سے خود کچھ نہ کھائے تو وہ اسے کھا لے، کیونکہ یہ اس کتے نے اسی کے لیے روک رکھا ہے۔

۴۔ البتہ اگر اس کتے نے خود بھی کھایا ہے تو اب اس شکار کو کھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ شکار اس نے اپنے لیے روکا ہے۔

۵۔ اگر اس کتے کے ساتھ دوسرے کتے بھی شامل ہو جائیں اور وہ سب مل کر شکار کو ماریں، لیکن اسے کھائیں نہیں، تب بھی وہ اس کو نہ کھائے، کیونکہ اسے معلوم نہیں ہے کہ وہ شکار اس کے اپنے سدھائے ہوئے کتے نے مارا

ہے یا دوسرے آوارہ کتوں نے۔

حرمت کا دائرہ

(۸)

عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: تُصُدِّقَ عَلٰى مَوْلَاةٍ لِمَيْمُونَةَ بِشَاةٍ فَمَاتَتْ فَمَرَّ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: هَلَّا أَخَذْتُمْ إِهَابَهَا فَدَبَغْتُمُوهُ فَانْتَفَعْتُمْ بِهِ فَقَالُوْا: إِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ: إِنَّمَا حَرُمَ أَكْلُهَا. (مسلم، رقم ۸۰۶)

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی کو صدقے میں بکری دی گئی تھی، وہ مرگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: تم نے اس کی کھال کیوں نہیں اتاری کہ دباغت کے بعد اس سے فائدہ اٹھاتے؟ لوگوں نے عرض کیا: یہ تو مردار ہے، آپ نے فرمایا: اس کا صرف کھانا ہی حرام ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

توضیح:

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ واضح کیا ہے کہ شریعت نے جس چیز کو جس پہلو سے حرام کیا ہے، وہ چیز بس اسی پہلو سے حرام ہوتی ہے۔ چنانچہ شریعت کے مطابق ہم مردہ جانور کو کھا تو نہیں سکتے، البتہ اس کی کھال وغیرہ اتار کر اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

محمد عمار خان ناصر

قرآن مجید بطور کتاب تذکیر۔ چند توجہ طلب پہلو

[الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں دورۂ تفسیر قرآن کے شرکا سے گفتگو]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے اور اس کے تفسیری مباحث پر غور کرتے ہوئے ایک بنیادی سوال جس کے حوالے سے قرآن مجید کے طالب علم کا ذہن واضح ہونا چاہیے، یہ ہے کہ قرآن کا اصل موضوع اور قرآن نے جو کچھ اپنی آیات میں ارشاد فرمایا ہے، اس سے اصل مقصود کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ہمیں خود قرآن مجید کی تصریحات سے یہ ملتا ہے کہ یہ اصل میں کتاب تذکیر ہے۔ قرآن نے اپنے لیے 'ذکر'، 'تذکرہ' اور 'ذکری' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ تذکیر کا مطلب ہے یاد دہانی کرانا۔ ایسے حقائق جو انسان کے علم میں تو ہیں اور وہ ان سے بالکل نامانوس نہیں ہے، لیکن کسی وجہ سے ان سے غفلت کا شکار ہو گیا ہے اور وہ اس کے فعال حافظے سے محو ہو گئے ہیں، وہ حقائق اسے یاد کرانا، ان کی طرف اس کی توجہ مبذول کرنا اور ان حقائق کی یاد دہانی سے اس کو اپنی زندگی میں ایک خاص طرح کا رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنا، یہ 'تذکیر' کی اصل روح ہے۔ معروف اور مانوس لیکن بھولی ہوئی باتوں کو یاد کرانا اور اس یاد دہانی کے ذریعے سے انسان کے فکر کو، اس کے عمل کو اور اس کے رویے کو ایک خاص رخ پر ڈالنا، یہ تذکیر ہے۔

قرآن مجید اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ایک کتاب تذکیر ہے۔ اللہ تعالیٰ چند حقائق کی تذکیر انسان کو کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ حقائق انسان کے ذہن میں مستحضر رہیں اور انسان کا دھیان اور اس کی توجہ ان پر لگی رہے اور ان کی

مدد سے وہ زندگی کے ایک ایک قدم پر صحیح راستے پر قائم رہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کا، اس کی صفات کا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لیے جو قانون، ضابطے، قاعدے، سنن اور نوامیس مقرر کیے ہیں جن کے تحت وہ اس دنیا کا نظام چلا رہا ہے، خاص طور پر انسانوں کے معاملات وہ جن ضابطوں کے تحت چلاتا ہے، ان کا تعارف انسان کو کروانا، یہ نزول قرآن کی اصل غایت ہے۔

قرآن مجید کے جتنے مضامین ہے، ان کی آپ ذیلی تقسیمات کریں تو وہ بے شمار بن جاتے ہیں اور مختلف اہل علم نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے قرآن میں پھیلے ہوئے مضامین ومطالب کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ ہمارے ہاں ایک معروف تقسیم شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'الفوز الکبیر' میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کے مضامین کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تذکیر بآلاء اللہ، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت اور اس کی رحمت وربوبیت کی جو نشانیاں کائنات میں بکھری ہوئی ہیں، ان کی یاددہانی۔

۲۔ تذکیر بایام اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے دنیا کی مختلف قوموں کے ساتھ نعمت ونقمت، دونوں پہلوؤں سے جو معاملہ کیا ہے، ان کی یاددہانی۔

۳۔ تذکیر بما بعد الموت، یعنی اس بات کی یاددہانی کہ اس دنیا سے جانے کے بعد جو ایک یوم الجزاء آنے والا ہے، اس دن اللہ تبارک وتعالیٰ انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔

۴۔ احکام وشرائع، یعنی شریعت کے وہ قوانین جن کی پابندی اس دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کو انسانوں سے مطلوب ہے۔

۵۔ علم المخاصمۃ، یعنی قرآن کا مخاطب بننے والے جو گروہ قرآن کے دعاوی اور اس کے پیغام کو تسلیم کرنے اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے گریزاں تھے اور اس پر ان کے ذہن میں کچھ استدلالات اور کچھ شبہات تھے، ان کا جواب دینا اور ان کی تردید کر کے صحیح بات کو واضح کرنا۔

یہ بڑی حد تک ایک جامع تقسیم ہے جس میں قرآن مجید کے کم وبیش سارے نمایاں مطالب اور مضامین آ جاتے ہیں۔ اب ان پانچوں پر اگر آپ غور کریں تو مرکزی نکتہ یہ نکلے گا کہ انسان کو اس بات کی پہچان کرا دی جائے کہ اس کائنات کا خالق ومالک کیسا ہے، اس کی صفات کیا ہیں، اس کی صفات سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں اور جو مظاہر وجود میں آتے ہیں، وہ کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے وہ کون کون سے قوانین مقرر کیے ہیں جن کے تحت وہ اپنی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مخلوق کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ گویا یہ سب مضامین مختلف پہلوؤں سے تذکیر ہی کے مقصد کو پورا کرتے ہیں اور مختلف حوالوں سے، مختلف زاویوں سے انسان کے ذہن میں اس بات کے شعور کو راسخ کرتے ہیں کہ وہ اپنے مالک کو پہچانے اور اس کے ذہن میں اللہ کی ذات اور اس کی صفات کا صحیح تصور قائم ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں کسی بھی ہستی کے بارے میں جو تصور ہوگا، اسی کے لحاظ سے اس کا اس کے ساتھ تعلق بھی قائم ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے قوانین اور اس کے معاملہ کرنے کے اصولوں اور ضوابط کا جو تصور انسان کے ذہن میں ہوگا، اسی کے لحاظ سے انسان کا تعلق بھی خدا کے ساتھ قائم ہوگا۔ یہ ساری باتیں جس درجے میں انسان کے ذہن میں واضح ہوں گی، اسی کے لحاظ سے خدا کے ساتھ اس کا تعلق بھی ایک خاص رنگ اختیار کرلے گا۔

اللہ نے اپنے لیے کچھ نوامیس مقرر کیے ہیں جن کے تحت وہ اپنی ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ کوئی دوسری ہستی اللہ کو کسی بات کی پابند نہیں کرسکتی: 'لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ' (الانبیاء: ۲۳)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی عالی صفات مثلاً عدل، رافت و رحمت کے تقاضے سے خود اپنے لیے کچھ قوانین مقرر کیے ہیں جن کی پابندی وہ کہتا ہے کہ میرے ذمے لازم ہے۔ کسی دوسرے نے لازم نہیں کی اور نہ کوئی کرسکتا ہے، لیکن ان کی پابندی اس نے خود اپنے ذمے لازم کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: 'حَقًّا عَلَيْنَا' (یونس: ۱۰۳)۔ یہ جو ہم نے وعدہ کیا ہے، اس کی پابندی اب ہم پر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے جو قوانین اور نوامیس مقرر کیے ہیں، ان کے لیے قرآن نے 'سنت' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً دنیا میں حق کا انکار کرنے والی قوموں کے ساتھ معاملہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ایک خاص قانون بنایا ہے جس کے ظہور کی مثالیں تاریخ میں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں۔ قرآن اس کو 'سنت اللہ' کہتا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا: 'سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا' (الاحزاب: ۶۲)۔

اللہ نے اس ساری کائنات کے لیے کیا ضابطے بنا رکھے ہیں، وہ تو اس نے ہمیں نہیں بتائے۔ ہمیں تو اس نے قرآن میں مخاطب کیا ہے اور صرف اس دائرے کے قوانین اور ضابطے بتائے ہیں جس کا تعلق ہم انسانوں سے ہے۔ سورج چاند اور دوسری مخلوقات کو اس نے کن قوانین کے تحت بنایا ہے، وہ اس نے ہمیں نہیں بتائے۔ کائنات کے مادی قوانین بھی، جن کو سائنس دریافت کرتی ہے، قرآن کا موضوع نہیں کہ وہ انسان کو یہ بتائے کہ سورج، چاند اور دوسرے مظاہر فطرت کن قوانین کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح باقی مخلوقات سے متعلق جو اخلاقی قوانین ہیں، ان کی وضاحت بھی قرآن کا موضوع نہیں۔ مثال کے طور پر ایک انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی کسی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ضرورت یا خواہش کی تکمیل کے لیے کسی دوسرے انسان کی جان لے، لیکن آپ جانوروں میں دیکھیں گے کہ بہت سے درندوں کی زندگی اور بقا کا دارومدار ہی اس پر ہے کہ وہ کسی دوسرے جاندار کی، بسا اوقات اپنے ہی کسی ہم جنس جاندار کی جان لیں اور اس کے گوشت سے اپنا پیٹ بھریں۔ اب حیوانات کے اور اسی طرح دوسری بے شمار مخلوقات کے معاملات کن اخلاقی قوانین اور ضابطوں پر مبنی ہیں، ان کی وضاحت قرآن کا موضوع نہیں اور نہ اس نے ان کی وضاحت کی ہے۔ قرآن کا موضوع یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں اللہ نے ایک خاص مقصد کے تحت بھیجا ہے اور اس کی نقل وحرکت کا اور زندگی کی سرگرمیوں کا ایک محدود دائرہ ہے۔ اللہ نے کائنات کے اربوں کھربوں بلکہ اس سے بھی حقیر ایک چھوٹے سے حصے میں انسان کو بسایا ہے اور اس کو ایک نہایت محدود دائرے میں اختیار دیا ہے۔ انسان کو یہاں بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آزمایش کی جائے۔ اس آزمایش میں کامیاب ہونے کے لیے انسان کو اپنے خالق و مالک اور اس کے مقرر کردہ قوانین کی پہچان کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے خدا کے ساتھ صحیح طور پر تعلق قائم کر سکے اور اس معرفت صحیحہ کا ظہور اس کے فکر وعمل اور اس کے کردار میں بھی ہو۔ یہ سب باتیں انسان کے علم میں ہونی چاہییں تاکہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد خدا کے حضور میں پیش ہو تو اس کی ابدی نعمتوں کا حق دار بن سکے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ ہے قرآن کی ساری تذکیر اور اس کے تمام تر مطالب ومضامین کا محور۔ دین کے جو تین بنیادی عقیدے ہیں جن پر پورے دین کی بنیاد ہے، وہ بھی یہی ہیں۔ خدا کو ماننا اس کی تمام صفات کے ساتھ اور ان تمام قوانین ونوامیس کے ساتھ جو اس نے اپنے لیے مقرر کیے ہیں، نبوت ورسالت کے اس سلسلے پر ایمان رکھنا جو اللہ نے اپنی صفات اور اپنے قوانین اور ضابطوں سے انسانوں کو متعارف کرانے کے لیے دنیا میں جاری کیا اور اس حقیقت پر ایمان رکھنا کہ دنیا کی اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی آنی ہے جس میں انسان اپنے قول وعمل کے لحاظ سے ابدی عذاب یا ابدی نعمتوں کا مستحق قرار پائے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس معاملے کا ایک اور نہایت اہم پہلو بھی آپ کے سامنے رہنا چاہیے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید سے اس کا یہ مطمح نظر بڑے غیر مبہم طریقے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے لوگ اسی چیز کے حصول پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھیں جو اس کے نزول کا اصل مقصد ہے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ اپنی اپنی دلچسپیاں لے کر آئیں اور ان میں الجھ کر رہ جائیں۔ قرآن نے بعض پہلوؤں سے اپنا یہ مطمح نظر واضح کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے اور اپنے انداز سے، اپنے اسلوب سے یہ بات سمجھائی ہے کہ قرآن کو پڑھنے کے لیے آؤ تو کیا ذہن لے کر آؤ اور تمھاری دلچسپی کا مرکزی نکتہ کیا

ہونا چاہیے۔مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ قرآن مجید کا ایک بہت بڑا حصہ واقعات پر مشتمل ہے۔شاید ایک تہائی یا اس سے زیادہ آپ کو قرآن میں واقعات ہی ملیں گے۔شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اسی لیے اس حصے کو تذکیر بایام اللہ کا ایک مستقل عنوان دے دیا ہے۔قرآن میں انبیا کے، دنیا کی قوموں کے اور قوموں کی تاریخ کے واقعات ہیں۔ان واقعات کے ذکر سے قرآن کا مقصود انسان کا دل بہلانا یا اس کی تفریح طبع نہیں۔گزشتہ زمانے کے واقعات کے بارے میں جستجو اور ان میں دلچسپی محسوس کرنا انسانی نفسیات کا حصہ ہے۔عام طور پر انسان جب ایسے واقعات کو سنتے ہیں تو اس کا مقصد جستجو کے جذبے کی تسکین یا محض تفریح طبع ہوتا ہے۔تاہم قرآن کے، واقعات بیان کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے۔اس سے اس کا مقصد وہی تذکیر ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ان واقعات سے انسان روحانی و اخلاقی سبق حاصل کرے اور ان واقعات میں اللہ تعالیٰ کے جن ضابطوں اور قوانین کا ظہور ہوا، ان کی طرف متوجہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ کسی بھی واقعے سے متعلق ایسا لوازمہ جو اس میں کہانی کا مزہ پیدا کرتا ہے اور ایسے پہلو جو اسے تفریح طبع کا سامان بنا سکتے ہیں، قرآن کم و بیش ہر جگہ ایسے عناصر کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔وہ ایک طویل عرصے کو محیط سلسلہ واقعات کے بے شمار اجزا کو حذف کر کے اس کے صرف ان اجزا کو بیان کر دیتا ہے جو اس کے مقصد کے لحاظ سے مفید ہیں۔کئی سالوں پر پھیلے ہوئے سلسلہ واقعات کو قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ، کچھ درمیانی حصے اور کچھ اختتامی حصہ معرض بیان میں آ جاتا ہے اور یہ تمام اجزا وہ ہوتے ہیں جو تذکیر کے پہلو سے مفید اور برمحل ہوتے ہیں۔باقی تمام تفصیلات جن کو اگر قرآن بیان کرنے لگ جائے تو لوگ قصے میں الجھ کر رہ جائیں اور اس سے کہانی کا لطف اٹھانے لگیں، ان سب کو قرآن حذف کر دیتا ہے۔اس کی چند مثالیں دیکھیے:

قرآن مجید نے حضرت موسیٰ کی پیدایش سے لے کر وادئ تیہ تک ان کی زندگی کا سفر بیان کیا ہے، لیکن اس سارے واقعے کے صرف وہ اجزا منتخب کیے ہیں جن میں تذکیر کا کوئی نہ کوئی پہلو پایا جاتا ہے اور جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کا کوئی خاص ضابطہ اور کوئی مخصوص قانون واضح کرنے میں مدد ملتی ہے۔قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی پیدایش سے پہلے مصر میں صورت حال کیا تھی اور بنی اسرائیل کس طرح ظلم و ستم کا شکار تھے۔پھر حضرت موسیٰ کی پیدایش کا ذکر ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے کس طرح انھیں فرعون کی قتل اولاد کی اسکیم سے معجزانہ طور پر محفوظ رکھا اور خود فرعون کے گھر میں ان کی پرورش کا انتظام کر دیا۔اس کے بعد اگلا منظر جو سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ جوانی کی عمر کو پہنچ گئے ہیں۔ظاہر ہے کہ اس درمیانی عرصے میں بھی کئی واقعات رونما ہوئے ہوں گے جن سے قرآن نے کوئی تعرض نہیں کیا۔جوانی کے زمانے کا بھی صرف وہ واقعہ منتخب کیا ہے جو سلسلہ واقعات

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کوآگے بڑھانے والا ہے، چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ کیسے حضرت موسیٰ نے قبطی کے مقابلے میں اپنے اسرائیلی بھائی کی مدد کی اوراس کے نتیجے میں انھیں ہجرت کر کے مدین جانا پڑا۔ پھر وہاں اللہ نے ان کے لیے کیا بندوبست کیا، اس کا ذکر ہوا ہے۔ مدین سے واپسی پر راستے میں انھیں نبوت سے سرفراز کیا جاتا ہے اور پھر وہ سیدھے فرعون کے دربار میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح کئی سالوں پر پھیلے ہوئے سلسلہ واقعات کو قرآن نے صرف چند اجزا میں سمیٹ دیا ہے۔

اس ضمن میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ایک خاص پہلو سے توجہ طلب ہے۔ اس واقعے کو قرآن نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور اگرچہ یہاں بھی قرآن نے واقعے کے وہی حصے منتخب کیے ہیں جن سے کوئی نہ کوئی تذکیری فائدہ حاصل ہوتا ہے، تاہم یہ واقعہ نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہ واقعہ پڑھتے ہوئے آپ کو محسوس ہوگا کہ حضرت یوسف کی کہانی سے متعلق بعض ایسے اہم سوالات سامنے آتے ہیں جن سے قرآن کوئی تعرض نہیں کرتا، جبکہ کہانی کے تسلسل کے اعتبار سے اس میں ایک خلا سا رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ انسان اپنے ذہنی قیاسات سے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کرتا رہے، لیکن قرآن کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مثلاً یہ دیکھیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن میں ہی خواب کے ذریعے سے یہ بتا دیا گیا تھا کہ اللہ کی طرف سے ان پر خاص رحمت اور عنایت ہوگی۔ یہ بھی ان کو معلوم ہے کہ ان کے سوتیلے بھائی ان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ پھر جب بھائی ان کو لے جا کر کنویں میں پھینک دیتے ہیں تو اس وقت بھی اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب تم یہ سب کچھ اپنے بھائیوں کو بتاؤ گے۔ اس کے بعد یوسف علیہ السلام مصر پہنچ جاتے ہیں۔ قرآن سے یہ واضح ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اپنا بچپن، اپنا خاندان اور یہ سارا سلسلہ واقعات اچھی طرح یاد ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کے والد کون ہیں، ان کا خاندانی پس منظر کیا ہے، لیکن مصر میں فروخت ہونے سے لے کر منصب اقتدار پر فائز ہونے تک کے اس سارے عرصے میں وہ کہیں بھی اس بات کی کوشش کرتے نظر نہیں آتے کہ اپنے والد سے رابطہ کریں۔ ان کے والد ان کی جدائی کے غم میں نڈھال ہیں، رو رو کر بینائی کھو چکے ہیں، ان کی ملاقات کے شوق میں تڑپ رہے ہیں اور کوئی ظاہری امید نہ ہونے کے باوجود پر امید ہیں کہ یوسف زندہ ہے، لیکن ادھر حضرت یوسف کے ہاں ایسی کسی تڑپ یا کسی کوشش کا ذکر قرآن میں نہیں ملتا۔ یہ چیز عام انسانی نفسیات کے لحاظ سے بڑی عجیب سی لگتی ہے۔ معلوم نہیں، حضرت یوسف نے اس سلسلے میں کیا کیا ہوگا۔ کچھ کیا بھی ہوگا یا نہیں کیا ہوگا۔ بہرحال یہ ایک سامنے کا سوال ہے جو شاید ہر پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہوگا کہ جب یوسف کو اپنے والد کے بارے میں معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ان کی جدائی پر سخت بے چین اور مضطرب ہوں گے تو وہ ان سے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رابطہ کر کے انھیں صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ خاص طور پر بادشاہ کا وزیر بن جانے کے بعد تو کوئی ظاہری رکاوٹ بھی اس میں دکھائی نہیں دیتی، تاہم قرآن اس پہلو سے سرے سے کوئی تعرض نہیں کرتا کہ انھوں نے اس کی کوشش کی یا نہیں کی۔ نہیں کی تو کیوں نہیں کی اور اگر کی تو اس کا کیا بنا اور وہ کیوں کامیاب نہیں ہوئی۔

اب دیکھیں، قرآن یہاں اپنے انداز سے یہ واضح کر رہا ہے کہ جب وہ یہ واقعہ بیان کر رہا ہے اور بڑی تفصیل سے بیان کر رہا ہے تو واقعے سے متعلق ایک بڑے نمایاں سوال کا جواب دینے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قاری کو اس کا جواب ملتا ہے تو ملے، نہیں ملتا تو نہ ملے۔ قرآن کا مقصد کہانی سنانا اور کہانی کا پورا لوازمہ فراہم کرنا نہیں۔ وہ تو حضرت یوسف کے واقعے میں تذکیر کے اور تربیت کے جو پہلو ہیں، بس ان کو سامنے لانا چاہتا ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جو واقعہ سورۂ سبا میں نہایت اختصار سے بیان ہوا ہے، وہ بھی بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے۔ بیان ہوا ہے کہ جب ان کی موت کا وقت آیا تو وہ اپنی لاٹھی کا سہارا لیے کھڑے تھے۔ اسی حالت میں اللہ نے ان کی روح قبض کر لی۔ جنات جنھیں ان کی غلامی میں دیا گیا تھا، ان کو پتہ نہ چل سکا۔ زمین کے کیڑے نے حضرت سلیمان کی لاٹھی کو کھانا شروع کیا اور جنات کو اس وقت خبر ہوئی جب لکڑی اتنی کھوکھلی ہو گئی کہ حضرت سلیمان کا وزن نہ سہار سکی اور وہ گر گئے۔ تب جنات کو پتہ چلا کہ حضرت سلیمان کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہاں دیکھیں، قرآن نے اپنے مقصد کے تحت واقعے کا صرف یہ پہلو بیان کر دیا ہے کہ جنوں کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو حضرت سلیمان کی وفات کے بعد وہ اس ''عذاب مہین'' میں مبتلا نہ رہتے، لیکن اس مختصر بیان سے ایک سوال ہر پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان وفات کے بعد لکڑی کے سہارے آخر کتنا عرصہ کھڑے رہے؟ ظاہر ہے کہ کیڑے کو لکڑی کو کھوکھلا کرتے ہوئے کچھ دن تو لگے ہوں گے۔ کیا اس سارے عرصے میں حضرت سلیمان وہیں لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے اور ان کی اس کیفیت پر کسی کو تعجب نہیں ہوا؟ کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ اتنے دن سے وہ نہ کہیں آ جا رہے ہیں، نہ کھا پی رہے ہیں اور نہ نماز پڑھ رہے ہیں؟ اس سوال سے قرآن کوئی تعرض نہیں کرتا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے واقعے کے بیان میں بھی یہی اسلوب ہے۔ قرآن جب نازل ہوا تو یہودی اور مسیحی صدیوں سے یہ عقیدہ رکھتے چلے آ رہے تھے کہ حضرت مسیح کو یہودیوں نے سولی چڑھا کر قتل کر دیا تھا۔ قرآن آ کر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ یہ بات درست نہیں۔ یہودی نہ انھیں سولی چڑھانے میں کامیاب ہوئے اور نہ کسی اور طریقے سے قتل کرنے میں، بلکہ اس معاملے کو ان کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا جس کی وجہ سے وہ یہی سمجھتے رہے کہ انھوں

نے سیدنا مسیح کو سولی چڑھا دیا ہے، حالانکہ حقیقت میں اللہ نے حضرت مسیح کو بحفاظت آسمانوں کی طرف اٹھا لیا تھا۔ اب دیکھیں، قرآن مذہبی تاریخ کے ایک نہایت اہم واقعے کی اصل حقیقت کو واضح کرتے ہوئے صرف دو لفظوں میں یہ کہہ کر گزر جاتا ہے کہ یہ معاملہ یہود و نصاریٰ کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔ وہ اس اشتباہ کی نوعیت اور واقعے کی عملی تفصیلات سے جن سے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہو، بالکل کوئی تعرض نہیں کرتا، اس لیے کہ یہ سب باتیں اس کے مقصد سے متعلق نہیں۔ آپ غور کرتے رہیں، چاہیں تو اسرائیلیات کو پڑھیں اور یہود و نصاریٰ کے لٹریچر کا مطالعہ کریں تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ کیا ہوا ہو گا، لیکن قرآن کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں قرآن جگہ جگہ اپنے اسلوب سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ جتنی بات اس نے بیان کی ہے، یقیناً اس کی کچھ زائد تفصیلات بھی ہیں جن کو جاننے کی انسان کو جستجو ہو سکتی ہے، لیکن قرآن کو ان سے غرض نہیں۔ قرآن کا مقصد یہ نہیں کہ وہ پورے واقعے کو اس کی جملہ تفصیلات کے ساتھ بیان کرے تاکہ سننے والے کو کسی پہلو سے تشنگی کا احساس نہ ہو۔ وہ قاری کی توجہ کو اپنی نظر میں مقصود معنوی حقائق پر مرکوز رکھنا چاہتا ہے اور اپنے انداز سے قاری کو متنبہ کرتا رہتا ہے کہ واقعات کے بیان سے قرآن کے اصل مقصد کو سمجھے اور اسی کو اپنا مطمح نظر بنائے۔

قرآن کے اصل مقصد کی وضاحت کے ضمن میں میں نے جو کسی قدر طول بیانی سے کام لیا، شاید وہ آپ کو بے فائدہ دکھائی دیتی ہو۔ اس لیے کہ یہ بات بظاہر ایک سادہ سی اور معلوم و معروف سی بات لگتی ہے اور ظاہری نظر سے دیکھیں تو علم تفسیر کے طلبہ کے سامنے اس کا ذکر شاید تحصیل حاصل بھی لگتا ہے۔ قرآن مجید نے اپنا یہ تعارف کروایا ہے اور اس کے لفظ لفظ سے اس کا یہ مقصد ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن کو پڑھنے والا ہر مسلمان اس سے واقف ہے کہ قرآن اس مقصد کے لیے نازل کیا گیا ہے اور یہ یہ اس کے مطالبات ہیں۔ اس لیے یہ سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نکتے کو خاص طور پر موضوع بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ قرآن کا مطالعہ کرنے والے اور خاص طور پر علم تفسیر سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لیے خاص طور پر سمجھنے کی بات ہے۔

اصل میں ہوا یہ ہے اور انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا رہا ہے کہ اللہ کی کتاب نے اپنا جو اصل موضوع متعین کیا اور اپنے مضامین و مطالب کا جو اصل مقصد بیان کیا، ایک خاص وقت گزر جانے کے بعد لوگوں کی توجہ اس اصل مقصود سے ہٹ کر کچھ اور باتوں پر مرکوز ہو گئی۔ میں نے 'توجہ ہٹنے' کا لفظ استعمال کیا ہے، لاعلمی یا جہالت کا نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اصل مقصد لوگوں کے دائرۂ معلومات میں نہیں رہتا۔ وہ لوگوں کے علم میں ہوتا ہے، لیکن جس چیز کو 'مرکز توجہ' کہتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ بدل جاتا ہے۔ اس کتاب کو اتارنے سے جو چیز اللہ کو مقصود ہے کہ انسان جب اس کو

پڑھیں تو ان کے ذہن کا رخ اس طرف ہو، وہ مرکز توجہ نہیں رہتی اور اس کے ساتھ ملحق، اس کے ارد گرد گھومنے والی کچھ دوسری باتیں، کچھ اضافی معلومات اور کچھ زوائد زیادہ توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس دنیا میں انسان کے لیے ظاہر ہے کہ دلچسپی کی چیزیں بے شمار ہیں۔ یہ چیزیں مادی بھی ہیں اور ذہنی وفکری بھی۔ ایک عام آدمی کی سوچ کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور اس کے فکر کی سطح بھی سادہ ہوتی ہے، لیکن جب علم و دانش سے دلچسپی رکھنے والے لوگ کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کو دیے گئے بہت تھوڑے اور محدود علم کے باوجود، اس دنیا میں علم کے رنگ بے شمار اور اس کے اطراف و جوانب ان گنت ہیں اور علمی وفکری مزاج رکھنے والے افراد قدرتی طور پر ان میں دلچسپی بھی محسوس کرتے ہیں۔ انسان اپنی بنیادی فطرت کے لحاظ سے علوم وفنون میں اور ان تمام چیزوں میں غیر معمولی کشش محسوس کرتا ہے جنھیں انسان اپنی عقل سے دریافت کر سکتا ہے۔

اب جب اس طرح کے مختلف علوم وفنون کا پس منظر رکھنے والے حضرات کلام الٰہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر انسان میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس کے اپنے ذوق پر جس چیز کا غلبہ ہے، وہ کتاب الٰہی کو بھی اسی رنگ میں دیکھے۔ اس کی توجہ کتاب الٰہی میں ان پہلوؤں پر زیادہ مرکوز ہو جاتی ہے جو اس کے اپنے ذہنی وفکری پس منظر سے ہم آہنگ ہوتی ہیں اور وہ انھیں زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے غور وفکر اور اس کی دلچسپی کے دائرے سے تعلق رکھنے والے جو پہلو ہیں، انھیں زیادہ اجاگر کیا جائے۔ چنانچہ آپ دیکھیں، صحابہ و تابعین اور ابتدائی ایک دو صدیوں کے بعد رفتہ رفتہ قرآن مجید کی تفسیر میں کئی انداز سامنے آ گئے۔ آپ تاریخ تفسیر کی کوئی کتاب، مثلاً محمد حسین ذہبی کی مشہور کتاب 'التفسیر والمفسرون' اٹھا کر دیکھ لیں جس میں علم تفسیر کی تاریخ اور اس کے مختلف مناہج کا تعارف کروایا گیا ہے۔ آپ کو تفسیر کے ضمن میں بہت سے رجحانات مثلاً تفسیر بالرائے، تفسیر بالروایۃ، بلاغت کے پہلو سے قرآن کی تفسیر، تصوف کے نکات ومعارف کے لحاظ سے آیات قرآنی کی تشریح، فقہی احکام کے استنباط کے پہلو سے قرآن کی تفسیر اور اس طرح کے دوسرے رجحانات کا تعارف ملے گا۔ اب آپ ان سب کا تجزیہ کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ یہ مختلف رجحانات کیسے وجود میں آئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جن لوگوں کی علم نحو اور علم بلاغت کے ساتھ ایک خاص مناسبت تھی، انھوں نے اپنے زاویۂ نظر سے قرآن کو دیکھا۔ ظاہر ہے کہ قرآن عربی زبان کا ایک نہایت عالی شان شہ پارہ ادب ہے اور اسالیب زبان اور نحو و بلاغت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں غور وفکر کے لیے نہ ختم ہونے والا مواد اور لطائف ودقائق اخذ کرنے کی ایک وسیع جولان گاہ ہے۔ اسی طرح سے فقہا، جن کی توجہ اور غور وفکر کا محور احکام وقوانین کا استنباط ہے، قرآن کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں

نے اس کی کوشش کی کہ قرآن کی آیات سے، دلالت کے مختلف درجات کے تحت حتیٰ کہ لطیف اشارات تک سے جتنے زیادہ سے زیادہ فقہی احکام اخذ کیے جا سکتے ہیں، وہ کیے جائیں اور قرآن کے فقہی اور قانونی پہلو کو نمایاں کیا جائے۔

اس طرح جب مختلف علمی وفکری پس منظر رکھنے والے حضرات قرآن کی طرف متوجہ ہوئے تو انھوں نے اپنی اپنی دلچسپی کے لحاظ سے قرآن کو ایک خاص رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اب یہ جو کام ہوا، اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس طرح قرآن کی علمی خدمت اور اس کی شرح و وضاحت کے اتنے متنوع اور گوناگوں پہلو سامنے آ گئے، تاہم اس کے ساتھ اس کا ایک سلبی پہلو بھی ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ آپ جیسے جیسے ابتدائی دور کا تفسیری ذخیرہ دیکھتے ہوئے نیچے آتے جائیں گے، آپ کو ہر دور میں تفسیر کے مباحث میں مزید تنوع اور وسعت پیدا ہوتی نظر آئے گی۔ شروع کے دور کی تفسیریں دیکھیں تو صحابہ وتابعین کے ہاں قرآن کی کسی آیت کی تشریح میں آپ کو بہت سادہ انداز نظر آئے گا۔ کوئی لفظ مشکل ہے تو وہ اس کی وضاحت کر دیں گے۔ آیت کے مفہوم اور عملی مصداق کو واضح کرنے کے لیے کسی واقعے کا حوالہ دے دیں گے۔ اسی کو عام طور پر شان نزول کہہ دیتے ہیں۔ کسی آیت کے معنی ومفہوم کے حوالے سے کوئی اشکال کسی کے ذہن میں پیدا ہوا ہے تو اس کو وہ حل کر دیں گے۔ یہ ایک سادہ سا انداز ہے۔ لیکن جیسے جیسے آپ نیچے آتے جائیں گے، یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا ہوا دکھائی دے گا۔ آپ تفسیر کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو بے شمار علوم کی بحثیں مل جائیں گی۔ شروع میں لوگ اپنے اپنے مخصوص دائرے میں قرآن کے متن سے نکات ومعارف استنباط کرتے تھے۔ نحویوں نے اپنے انداز میں فوائد جمع کیے اور فقہا نے اپنے انداز میں۔ اس کے بعد جو لوگ آئے، انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ ان سب مباحث کو یکجا کر دیا جائے۔ اس طرح گوناگوں اور رنگا رنگ علوم وفنون کے مباحث تفسیر کے عنوان سے جمع کیے جانے لگے۔

(باقی)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پروفیسر خورشید عالم

عہد رسالت میں خواتین کا سیاسی کردار

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بصرہ کے واقعات

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بصرہ کی طرف خروج صحیح تھا یا غلط؟ اس کا انحصار بصرہ کے واقعات کو ٹھیک طریقے سے سمجھنے پر ہے۔ ان واقعات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سیاسی کردار پر خاص طور پر اور خاتون کے سیاسی کردار پر عام طور پر جو فیصلہ صادر کریں گے وہ غلط ہوگا۔ اس لیے ہم صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے درج ذیل نکات پر بحث کریں گے:

حضرت عائشہ کا حوأب کے چشمہ (کنوئیں) کے پاس سے گزر

حوأب مکہ سے بصرہ کے راستے میں بصرہ کے قریب ایک چشمہ (کنواں) ہے۔ اس بارے میں روایات کی بنیاد پر حضرت عائشہؓ پر لعن طعن کی گئی ہے اور ان کے موقف کو غلط ثابت کیا گیا ہے۔

ضعیف روایات

حوأب کا قصہ طبری نے اپنی کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' (۴/۴۵۹-۴۶۰) میں اسمٰعیل بن موسیٰ فزاری کی

سند سے ایک طویل روایت میں بیان کیا ہے۔ اس روایت کی سند کا تجزیہ درج ذیل ہے:

ابن عدی نے ''الکامل فی ضعفاء الرجال'' (۵۲۸/۱) میں کہا ہے کہ مبالغہ آرائی اور شیعہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرو۔ انھی کا قول ہے کہ میں نے عبدان الاہوازی کو کہتے سنا ہے کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ کو سنا ہے۔ اس نے ہمارا اسمٰعیل کے پاس جانا ناپسند کیا اور کہا: یہ فاسق جو سلف کو گالیاں دیتا ہے، تمھیں کیا تعلیم دے گا؟ اسمٰعیل یہ قصہ علی بن عابس اورق سے روایت کرتا ہے جسے نسائی اور ابن حجر نے ضعیف قرار دیا ہے اور وہ ابوالخطاب البحری سے روایت کرتا ہے جو مجہور ہے۔ وہ ایک دوسرے مجہول، یعنی صفوان بن قسیعہ الاحمسی سے روایت کرتا ہے۔ آخر میں اونٹ کے مالک عرنی کی شخصیت مجہول تر ہے۔ اونٹ کا مالک وہ نہیں، بلکہ یعلیٰ بن امیہ ہے جو اونٹ کو یمن سے لایا تھا اور حضرت عائشہؓ اس پر مکہ سے سوار ہو کر آئی تھیں۔

روایت کا متن اسے واضح طور پر موضوع قرار دے رہا ہے۔ اونٹ کے مالک اور حضرت عائشہ کے ساتھیوں کے درمیان گفتگو پر تکلف اور رکیک ہے۔ مثلاً اس کا قول کہ ''اس اونٹ پر چڑھ کر جسے میں نے طلب کیا، اسے پالیا اور اگر کسی اور نے میرا پیچھا کیا تو میں بچ نکلا۔ مالک نے پوچھا: تو اس اونٹ کو کس کے لیے چاہتا ہے؟ اس نے کہا: تیری ماں کے لیے۔ میں نے کہا کہ میری ماں تو گھر بیٹھی ہوئی ہے، وہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گی''۔ علما نے ایسی تمام روایات کو موضوع قرار دیا ہے جن میں لفظاً اور معناً رکاکت موجود ہو۔ اونٹ کے مالک عرنی کو ایک صحرا شناس کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ پہلے حضرت عائشہؓ کے ساتھیوں سے ملتا ہے، پھر حضرت علیؓ کے ساتھیوں سے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس راستے سے گزرے ہیں جس سے وہ گزرا ہے۔ گویا ان دونوں کے پاس اس وقت تک کوئی رہنما تھا جب وہ ان سے ملا۔ اونٹ کے اصل مالک نے عرینہ قبیلے کے ایک آدمی سے اونٹ دوسو دینار کے عوض خریدا تھا۔ قصہ گھڑنے والے نے بڑی ہوشیاری سے سارے قصہ کے ہیرو کو عرنی بتایا تاکہ اصل روایت اور موضوع روایت میں مشابہت برقرار رہے۔

حضرت عائشہؓ مکہ سے بصرہ اسی اونٹ پر سوار ہو کر آئیں جو یعلیٰ نے قتل عثمان کے بعد ام المومنین کو دیا تھا۔ اور قصے میں ہے کہ راستے میں حضرت عائشہؓ کی اونٹنی کو اس اونٹ سے بدل دیا گیا۔

قصے میں تہمت لگائی گئی ہے کہ ابن زبیر نے لشکر کے خلاف سازش کی اور حضرت عائشہؓ کو حضرت علیؓ کے لشکر سے خوف زدہ کر کے حوأب سے کوچ پر آمادہ کیا، حالاں کہ اس وقت تک فریقین میں سے کوئی بھی دوسرے سے خوف زدہ نہیں تھا اور وہ دونوں اصلاح کی تمنا کرتے تھے اور نہ ہی حضرت عائشہ اتنی اناڑی تھیں کہ کوئی ان کو خوف زدہ کرے

اور خوف زدہ کرنے والا کون؟ عبداللہ بن زبیر کے مقام و مرتبہ کا صحابی۔ وہ حضرت عائشہؓ کو وہ بات بھلا دیتا ہے جس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تھا۔ پھر قصے میں جس طرح حضرت علی کی طرف سے خلافت کے حق دار ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، اس سے رفض اور تشیع کی صاف صاف بو آ رہی ہے۔ وہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں اپنے آپ کو خلافت کا حق دار قرار دے رہے ہیں، جبکہ صحیح روایات کے مطابق وہ سب خلفاے راشدین کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مندرجہ بالا حقائق کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔

ایک روایت طبری (۴/۴۶۹) نے احمد بن زہیر سے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حوأب کے کتوں کو بھونکتے سنا تو کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون، میں ہی وہ ہوں جس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سب بیویوں کی موجودگی میں یہ کہتے سنا، ''کاش مجھے پتا چل جائے تم میں سے جس پر یہ کتے بھونکیں گے؟'' انھوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو عبداللہ بن زبیر ان کے پاس آئے۔ گمان کیا جاتا ہے (طبری کے یہ الفاظ غور طلب ہیں) کہ انھوں نے کہا: جھوٹا ہے وہ جو کہتا ہے کہ یہ حوأب کا مقام ہے وہ یہ بات کہتے رہے، یہاں تک کہ عائشہؓ چل پڑیں اور بصرہ پہنچ گئیں۔

اس کے علاوہ ایک اور مشہور اور غیر مستند روایت مسعودی اور بلاذری نے ابومخنف سے بیان کی ہے۔ کہ جب حضرت عائشہ نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو طلحہ، زبیر اور دیگر پچاس آدمیوں نے گواہی دی کہ یہ مقام حوأب نہیں۔ یہ اسلام میں پہلی جھوٹی گواہی تھی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ طلحہ اور زبیر جن کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہو، وہ جھوٹی گواہی دیں؟

حاکم نے مستدرک (۳/۱۱۹) میں اسی مضمون کی ایک روایت اپنے شیخ محمد بن عبداللہ الحفید سے روایت کی ہے جسے شیخ ناصر الدین البانی نے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ محمد بن عبداللہ مجہول ہے اور وہ علی الاعلان اپنے مسلک کی بنا پر نشہ کرتا تھا۔ آلوسی کا اس روایت کے بارے میں قول ہے کہ اس روایت میں 'إياك أن تكوني يا حميراء' (اے حمیراء، اس بات سے بچنا کہ تم ان بیویوں میں شامل ہو) کے الفاظ اہل سنت کی معتبر کتابوں میں موجود نہیں۔

طبری (۳/ ۲۶۳) میں ایک روایت سیف بن عمر کے واسطے سے بیان کی گئی ہے کہ جس عورت پر حوأب کے کتے بھونکتے تھے، وہ ام زمل سلمیٰ بنت مالک الفزاریہ ہے جس نے مقام ظفر اور حوأب کے درمیان مرتدین کے لشکر کی

قیادت کی تھی۔ یاقوت حمری نے بھی مادہ حوأب کے تحت ''معجم البلدان'' (۳۱۴/۲) میں اسی روایت کو بغیر سند کے بیان کیا ہے۔اسے شیخ البانی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

صحیح روایات

ابن ابی شیبہ نے ''المصنف'' میں قیس بن ابی حازم سے روایت بیان کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا ہوگا جب تم میں سے ایک پر حوأب کے کتے بھونکیں گے؟ یہ الفاظ بھی ہیں: ''تم میں سے کسی پر حوأب کے کتے بھونکیں گے''۔امام ذہبی نے اس حدیث کو سنداً صحیح قرار دیا ہے۔ابن کثیر نے اسے صحیحین کی شرط کے مطابق کہا ہے۔ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔البانی نے ''سلسلة الاحادیث الصحیحة'' (۴۷۵/۵) میں اس کی تخریج کی ہے۔امام احمد نے ایک ایسی سند کے ساتھ جو صحیحین کی شرط کے مطابق ہے، روایت کیا ہے کہ جب حضرت عائشہ حوأب کے چشمہ پر آئیں تو انھوں نے کتوں کو بھونکتے سنا اور کہا: میرا خیال ہے کہ میں لوٹ جاؤں، کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا: ''تم میں سے کس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے؟'' حضرت زبیر نے ان سے کہا: آپ واپس جائیں گی؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ آپ کی وجہ سے لوگوں کے درمیان صلح کرادے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ان صحیح روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حضرت عائشہؓ کو نہ کسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور نہ کسی کام سے منع کیا گیا ہے۔وہ روایات جن میں لفظ 'إياك' (تو بچنا) ہے، ان کو علما نے صحیح قرار نہیں دیا۔صحیح روایات میں حضرت عائشہ کے حوأب کے پاس سے گزرنے کا وہ منفی اثر نہیں جو من گھڑت روایات میں بیان ہوا ہے اور نہ ان کا حضرت عائشہ کی ذات پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے سنجیدگی سے واپس جانے کے بارے میں سوچا ہو۔انھوں نے اس کے لیے 'ظــــن' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے انھیں واپس جانے کے بارے میں گمان ہوا ہوگا، لیکن جب حضرت زبیر نے مسلمانوں کی اصلاح کی بات کی تو وہ گمان ختم ہو گیا۔امام آلوسی کا قول ہے: ''پھر اس میں کوئی ممانعت وارد نہیں۔حضرت عائشہ اپنے اجتہاد سے چل نکلیں، انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس راستے میں حوأب کا مقام ہے اور جب انھیں پتا چلا تو لوٹنا ان کے لیے ممکن نہ تھا، کیونکہ باقی صحابہ اس پر متفق نہیں تھے اور پھر اس سے اصلاح کا مقصد بھی فوت ہو جاتا۔اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دور سے دیکھ رہا ہے کہ ایک بچہ کنویں میں گر جائے گا، وہ اسے بچانے کے لیے بھاگتا ہے اور لاشعوری میں اس آدمی کے سامنے سے گزرتا ہے جو نماز پڑھ رہا ہے۔اگر وہ پیچھے لوٹے تو جو ہوگا اس کی تلافی ممکن نہیں۔وہ بچے کو گرنے سے بچا نہ سکے گا۔چنانچہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے''۔اسی کے لیے وہ مامور ہے۔

خلاصۂ بحث

چنانچہ علمی اور تاریخی لحاظ سے حوأب کے قضیہ سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا جو اس پہلو سے حضرت عائشہؓ کے سیاسی کردار پر نکتہ چینی کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اس سے اس سیاسی کردار کی تائید ہوتی ہے جو انھوں نے ادا کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کی پیشین گوئی کی اور اسے برا نہیں سمجھا۔ یہ حدیث تو نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ امام احمد نے ایک اور شکل میں اس پیشین گوئی کا ذکر کیا ہے، وہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے کہا کہ تمھارے اور عائشہ کے درمیان کوئی معاملہ ہوگا۔ انھوں نے کہا: میرے درمیان اے اللہ کے رسول؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، انھوں نے پوچھا: کیا میں ان کو لڑائی میں مشغول کروں گا؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، لیکن اگر ایسی بات ہو تو ان کو محفوظ مقام تک پہنچا دینا۔ چنانچہ حوأب کے چشمہ پر سے گزرنے والی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا موقف درست تھا اور وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے انھیں سیاسی کردار ادا کرنے کا حق حاصل تھا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عائشہؓ کی بصرہ میں صلح کی کاوشیں

بصرہ کے قریب پہنچنے کے بعد حضرت عائشہؓ نے وہاں کے سربرآوردہ لوگوں سے خط و کتابت کی اور ان کے جواب کا انتظار کیا۔ حضرت علی کی طرف سے مقرر کردہ بصرہ کے والی نے گفتگو کے لیے اپنے دو قاصد بھیجے۔ حضرت عائشہ نے ان کے سامنے اپنے خروج کا سبب بیان کیا۔ ان میں سے ایک عمران بن حصین فاضل صحابی تھے۔ انھوں نے عثمان بن حنیف کو جا کر کہا: ''میں تو بیٹھ رہا ہوں تم بھی بیٹھ جاؤ''، یعنی اس معاملہ میں شریک نہ ہو (تاریخ طبری ۴/ ۴۶۴) حضرت عائشہ کی بات سننے کے بعد اگر ان کو یقین ہو جاتا کہ عائشہ کا موقف غلط ہے تو وہ کبھی عزلت نشینی اختیار نہ کرتے، بلکہ ان پر عائشہؓ کا مقابلہ دینی لحاظ سے واجب ہو جاتا۔ حضرت عائشہ کی باتیں سننے کے بعد انھوں نے طرفین میں سے کسی کے موقف کو ترجیح نہ دی، اس لیے گوشہ نشینی اختیار کی۔

لوگوں سے حضرت عائشہ کے خطاب کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے، اسے سننے کے بعد لوگ دو فریقوں میں تقسیم ہو گئے: ایک فریق حضرت عائشہ کو برحق سمجھتا تھا، جبکہ دوسرا فریق ان سے اختلاف کرتا تھا اور عثمان بن حنیف کا ساتھ دے رہا تھا۔ عثمان بن حنیف اور حکیم بن جبلہ کے کھلم کھلا اعلان جنگ کے باوجود حضرت عائشہؓ کا منادی تو قاتلین عثمان کے خلاف بھی جنگ کرنے سے روک رہا تھا (طبری ۴/ ۴۶۴)۔

حضرت عائشہ کے خطبے کے بعد حُکیم بن جبلہ نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ حضرت عائشہ کے ساتھیوں نے بھی نیزے نکال لیے، لیکن وہ لڑائی سے رکے رہے تاکہ دوسرے بھی رک جائیں۔ حُکیم اور اس کے ساتھی باز نہ آئے اور لڑتے رہے۔ اصحاب عائشہ صرف دفاع میں لڑتے رہے، جبکہ حُکیم اپنے سواروں کو ابھارتا رہا (طبری ۴/ ۴۶۶)۔

یہ حُکیم بن جبلہ وہی تھا جس کے گھر میں عبداللہ بن سبا بصرہ آنے کے بعد ٹھہرا تھا۔ فسطاط جانے کے بعد بھی اس کی خط و کتابت حُکیم سے جاری رہی۔ یہ وہی تھا جس نے حضرت عثمان پر برسر منبر کنکریاں پھینکی تھیں اور جب فتنہ پرداز پہلی دفعہ حضرت عثمان سے بحث مباحثہ کے بعد مدینے سے چلے گئے تھے تو حُکیم اور اشتر نخعی مدینے ہی میں ٹھہرے رہے۔ حضرت عثمان کی جعلی تحریر کے پیچھے ان دونوں کا ہاتھ تھا۔ اسی تحریر کے بعد بلوائی دوبارہ مدینہ میں آ گئے اور حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر بصرہ کی طرف نکل پڑے، قریب تھا کہ حضرت علی سے مفاہمت ہو جاتی، مگر اچانک اس حُکیم نے جنگ چھیڑ دی (تاریخ طبری ۴/ ۴۷۰)۔

اس کے باوجود حضرت عائشہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ دائیں طرف مقاتلین سے دور ہٹ جائیں، یہاں تک کہ رات ان کے درمیان حائل ہو گئی۔ صبح سویرے عثمان بن حنیف ان کی طرف بڑھے۔ حُکیم بھی بڑبڑاتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ حضرت عائشہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف راستے میں جو مرد یا عورت اس کے کہنے پر حضرت عائشہؓ کو گالیاں نہ دیتا تھا، اسے نیزہ مار کر قتل کر دیتا تھا۔ قبیلہ عبدالقیس کے لوگ غصے میں آ گئے، انھوں نے حُکیم سے کہا: تو نے کل بھی یہی حرکت کی تھی اور آج بھی وہی حرکت کر رہا ہے۔ بخدا، ہم تجھے چھوڑ رہے ہیں تاکہ اللہ تجھ سے بدلہ لے۔ حُکیم بن جبلہ قاتلین عثمان کی معیت میں لڑتا رہا۔ قاتلین جانتے تھے کہ بصرہ میں ان کا کوئی ٹھکانا نہیں، اس لیے وہ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ عائشہؓ کے ساتھیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور سختی سے لڑنے لگے۔

حضرت عائشہؓ کا منادی انھیں جنگ سے روکتا رہا، مگر وہ لڑتے رہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی رہیں: صرف ان سے لڑو جو تم سے لڑے، دوسروں سے نہیں۔ حُکیم منادی کی پروا کیے بغیر جنگ کو بھڑکاتا رہا۔ جب طلحہ اور زبیر کو لڑنے والوں کی حقیقت کا پتا چل گیا تو انھوں نے کہا: اس اللہ کا شکر ہے جس نے بصرہ میں قاتلین عثمان کو جمع کر کے ہمیں بدلہ لینے کا موقع فراہم کیا۔ انھوں نے منادی کر دی جس نے عثمان کو قتل نہیں کیا، وہ اپنا ہاتھ روک لے۔ ہم صرف عثمان کے قاتلوں کو چاہتے ہیں۔ پھر انھوں نے سخت جنگ کی، یہاں تک کہ بصرہ کے قاتلین میں سے حرقوس بن زہیر کے سوا کوئی نہ بچا۔ زبیر اور طلحہ نے منادی کر دی: دیکھو، اگر تمھارے قبیلوں میں سے کسی ایک نے مدینہ پر چڑھائی کی ہو تو اسے ہمارے پاس لے آئیں۔

دونوں فریق لڑتے رہے، یہاں تک کہ عائشہ کے ساتھیوں نے صلح کی دعوت دے دی، اوران کے درمیان ایک تحریر لکھی گئی کہ مدینہ کی طرف ایک قاصد بھیج کر پتا چلایا جائے کہ آیا طلحہ اور زبیر کو حضرت علی کی بیعت پر مجبور کیا گیا یا نہیں۔ اگر تو ایسا ہوا تو عثمان بن حنیف بصرہ سے نکل جائے گا، ورنہ طلحہ اور زبیر وہاں سے نکل جائیں گے۔ قاصد یہ پیغام لایا کہ ان کو واقعی بیعت پر مجبور کیا گیا ہے۔ چنانچہ عثمان سے کہا گیا کہ وہ بصرہ سے نکل جائے، مگر وہ اپنے وعدے سے مکر گیا۔

تاریخ طبری (۴/ ۴۷۴) میں ہے کہ ان بلوائیوں کی ایک جماعت حضرت عائشہؓ کو قتل کرنے کے لیے ان کے گھر کے دروازہ تک پہنچ گئی۔ ان کے ساتھ ایک آدمی تھا جو رہنمائی کر رہا تھا، لیکن ان کے گھر کو مسلمانوں کی ایک جماعت نے گھیرے میں لیا تھا۔ انھوں نے حملہ آوروں کو قتل کر دیا۔ ان واقعات سے اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے لوگوں کو جنگ پر بھڑکایا۔ ان پر تو جنگ تھوپی گئی تھی اور وہ اپنے دفاع کے لیے لڑ رہے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیدہ عائشہ کے دوسرے شہروں کی طرف خطوط

حضرت عائشہؓ نے اہل شام، کوفہ، یمامہ اور اہل مدینہ کو خطوط لکھے اور ان کو بتایا کہ ہم لڑائی نہیں چاہتے، بلکہ اللہ کی حدود کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں لڑائی پر مجبور کیا گیا ہے۔ انھوں نے کسی سے مدد نہ طلب کی، بلکہ یہی کہا کہ وہ اس فتنہ سے الگ رہیں، قاتلین کی حمایت نہ کریں اور اپنے اپنے گھروں میں مقیم رہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا ہدف اصلاح تھا، نہ کہ جنگ۔

یہ روایت غلط ہے کہ حضرت عائشہ نے عثمان بن حنیف کے مثلہ (ناک کان کاٹنا) کا حکم دیا۔ امام طبری نے سیف بن عمر کی صحیح روایت (۴۶۸۴) میں بیان کیا ہے کہ بلوائیوں نے خود یہ کام کیا تھا۔ حضرت طلحہ اور زبیر نے اسے ناپسند کیا اور خبر حضرت عائشہ کی طرف بھیجی تو انھوں نے کہا: اسے آزاد کر دو۔ جہاں جانا چاہتا ہے چلا جائے، اسے قید مت کرو۔

کیا حضرت عائشہ کا خروج حضرت علی کے خلاف تھا یا انھیں خلافت کے منصب سے ہٹانے کے لیے تھا؟

یہ جو مشہور روایت ہے کہ بعض صحابہ نے حضرت علی کی بیعت نہیں کی، صحیح روایت نہیں۔ کسی صحیح روایت میں اس

بات کا اشارہ تک نہیں کہ ان صحابہ نے بیعت نہیں کی۔ ہاں روایات میں اس بات پر اختلاف ہے کہ بیعت پر ان کو مجبور کیا گیا یا نہیں۔ ہاں، حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھیوں نے قاتلین عثمان سے سبقت لینے اور ان سے انتقام نہ لینے پر اعتراض کیا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہے تھے کہ ان کے بارے میں تساہل سے کام لیا جا رہا ہے، کیونکہ اقامت حدود میں اتنی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ ابن حجر ''فتح الباری'' (۱۳/۷۰۰) میں لکھتے ہیں: ''کسی نے حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھیوں سے یہ روایت نہیں کی کہ ان کا حضرت علیؓ سے خلافت کے بارے میں جھگڑا تھا اور نہ ان میں سے کسی نے دعویٰ کیا کہ اسے خلیفہ بنا دیا جائے''۔ ابن العربی نے ''العواصم من القواصم'' (ص ۱۵۵) میں لکھا ہے: ''رہا یہ دعویٰ کہ وہ علی کو خلافت سے اتارنا چاہتے تھے، یہ باطل ہے کیونکہ خلع کے لیے سب کی رائے اور ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' وہ صرف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے نکلے تھے تاکہ حدود کے نفاذ میں تاخیر نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھی نہ تو حضرت علی کو خلافت سے اتارنا چاہتے تھے اور نہ ان کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا چاہتے تھے، لیکن انھوں نے حضرت علیؓ کو بتائے بغیر خروج کیا جو مناسب نہ تھا۔ یہ ایک غلطی تھی جس کے نتیجے میں ایک اور غلطی سرزد ہوئی کہ حضرت علیؓ ان کے پیچھے نکل پڑے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کے درمیان عدم اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ کو کہنا پڑا کہ طلحہ، زبیر اور ام المومنین میری خلافت سے ناراض ہو کر اکٹھے ہو گئے ہیں اور لوگوں کو اصلاح کی دعوت دے رہے ہیں، جبکہ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھی سمجھ رہے تھے کہ حضرت علیؓ نے اپنا موقف تبدیل کر لیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے حضرت علیؓ کو بتائے بغیر خروج کیا۔

اعتماد کے اس فقدان میں دو عامل کارفرما تھے:

ایک تو یہ کہ حضرت علیؓ کے گرد بلوائیوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا اور وہ ان کے لشکر میں بھی گھس گئے تھے، اس لیے انھیں ڈر تھا کہ اگر انھوں نے عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے حد نافذ کی تو حرم نبوی میں خون ریزی ہو گی۔ جب وہ بصرہ کی طرف نکلے تو ان کے لشکر میں زیادہ تر یہی بلوائی تھے جن کے متعلق وہ خود گلہ کرتے تھے کہ وہ ان کا کہنا نہیں مانتے اور انھوں نے ان کے اور ان سے پہلے خلیفہ کے خلاف سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ فسادیوں کے اس لشکر نے جو حضرت علیؓ کے ساتھ چپکا ہوا تھا، حالات کو بگاڑنے میں بڑا رول ادا کیا۔ انھوں نے حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان فتنہ و فساد پیدا کیا۔ آیندہ کے واقعات اس کے شاہد ہیں۔

دوسرا عامل یہ تھا کہ حضرت علیؓ فیصلہ کرتے وقت بڑے صحابہ کی رائے کی طرف خاص توجہ نہیں دیتے تھے۔ مثلاً جب حضرت عبداللہ بن عباس اور مغیرہ بن شعبہ نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ عثمانؓ کے عاملوں کو عجلت میں معزول نہ کریں

تو انھوں نے ان کے مشورہ کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ پھر جب ابن عباس اور ان کے بیٹے حسن نے مشورہ دیا کہ جب تک طلحہ اور زبیر ان فسادیوں سے نمٹ نہ لیں اور صلح نہ ہو جائے آپ گھر میں بیٹھے رہیں (طبری ۴/۴۵۶)۔ اگر فساد ہوگا تو آپ کے ہاتھوں سے نہ ہوگا۔

حضرت علی کے خروج کا مقصد

آپ کی نیت نیک تھی۔ وہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر تک پہنچ کر ان کو خروج سے روکنا چاہتے تھے۔ تاریخ طبری کی روایت کہتی ہے کہ وہ ان کے پاس جلدی سے پہنچ کر ان کو روکنا چاہتے تھے۔ وہ تو انھیں راستے میں روکنا چاہتے تھے، لیکن وہ نکل چکے تھے۔ وہ بلوائیوں کو مدینہ سے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ اہل مدینہ کا خون نہ بہے۔ چنانچہ عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کے ساتھ صلح کی غرض سے بصرہ کی طرف خروج سے پہلے انھوں نے اعلان کیا: ''کل کوئی ایسا شخص ہمارے ساتھ نہ جائے جس نے حضرت عثمانؓ کے قتل میں کسی نہ کسی صورت میں مدد کی ہے'' (تاریخ طبری ۴/ ۴۹۳)۔

حضرت علیؓ عائشہؓ کے ساتھیوں کو امت کے خلاف خروج نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ نے مدینہ سے بصرہ کی طرف کوچ کا ارادہ کیا تو جلیل القدر صحابی رفاعہ بن رافع نے حضرت علی سے پوچھا: اے امیر المومنین، آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آپ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: ہمارا ارادہ اصلاح کا ہے، بشرطیکہ وہ ہماری بات مان لیں۔ انھوں نے پوچھا: اگر انھوں نے بات نہ مانی؟ تو آپ نے فرمایا: ہم ان کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیں گے اور صبر کریں گے۔ انھوں نے کہا: اگر وہ اس پر راضی نہ ہوئے؟ آپ نے جواب دیا: جب تک وہ ہمیں کچھ نہ کہیں، ہم انھیں چھوڑ دیں گے۔ انھوں نے پوچھا: اگر انھوں نے ہمیں نہ چھوڑا؟ آپ نے فرمایا: ہم ان سے ہاتھ روکے رکھیں گے تو رفاعہ نے کہا: پھر ٹھیک ہے (تاریخ طبری، روایت سیف بن عمر ۴/ ۴۹۷)۔

حضرت علیؓ اس مسئلہ کو سیاسی اختلاف نہ تصور کرتے تھے۔ آپ نے ایک ساتھی سے پوچھا: یہ جو حضرت عثمانؓ کے خون کے بدلہ کا مطالبہ کر رہے ہیں، کیا ان کے پاس کوئی حجت ہے؟ آپ نے جواب دیا: ہاں، اس نے پوچھا: اس معاملے میں تاخیر کرنے کے لیے کیا آپ کے پاس حجت ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اس نے پوچھا: اگر کل ہم جنگ میں پھنس گئے تو ان کا اور ہمارا حال کیا ہوگا؟ آپ نے جواب دیا: ہمارے اور ان میں سے جس کا دل صاف ہوگا، وہ لڑائی میں حصہ نہیں لے گا اور اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

جب معرکہ ختم ہو گیا تو حضرت عمار بن یاسر نے حضرت علیؓ سے پوچھا: جن لوگوں کو ہم نے قتل کیا ہے، ان کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیٹوں کے بارے میں آپ کی کیا راے ہے؟ آپ نے فرمایا: ان پر تمھیں کوئی اختیار نہیں۔ انھوں نے کہا: اگر آپ اس بات کے علاوہ کوئی بات کہتے تو ہم آپ کی مخالفت کرتے، اس کا مطلب ہے کہ جن صحابہ نے آپ کے ساتھ خروج کیا، وہ بھی اس اختلاف کو سیاسی اختلاف تصور نہیں کرتے تھے۔

صلح کے لیے حضرت علیؓ کی کاوش

بصرہ کے قریب نزول سے پہلے حضرت علیؓ نے قعقاع بن عمرو کو حضرت عائشہؓ سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ اس نے ان سے پوچھا: اے ام المومنین، آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟ انھوں نے کہا: اصلاح کے لیے۔ اس نے طلحہ اور زبیر کو بلا بھیجا، جب وہ آئے تو ان سے بھی سوال پوچھا: کیا تم فرماں بردار ہو یا مخالف؟ انھوں نے کہا: فرماں بردار، انھوں نے اصلاح کی وجہ حضرت عثمانؓ کا قتل بتایا۔ قعقاع نے کہا: تم نے اہل بصرہ کے قاتلین عثمان میں سے چھ سو آدمیوں کو قتل کر کے صرف حرقوص بن زبیر کو زندہ چھوڑا۔ جب تم نے اس کا مطالبہ کیا تو چھ ہزار لوگ اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ مضر اور ربیعہ کے قبیلوں میں تمھارے حمایتی تمھیں چھوڑ کر ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اگر تم ان سے لڑتے تو وہ تم پر ٹوٹ پڑتے۔ تم نے احتیاط کی، جس بات کے لیے تم مجبور کر رہے ہو، وہ اس سے کہیں بڑھ کر احتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا: تمھاری کیا راے ہے؟ اس نے کہا کہ اس کا علاج سکون ہے۔ عثمان کا قتل ایک عام آدمی کا قتل نہیں، انھوں نے بات مان لی اور وہ حضرت علیؓ کے پاس لوٹ گیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے دو اور قاصد بھیجے جنھوں نے قعقاع کی بات کی تائید کی، لشکر میں شامل سب قبائل کو صلح کا یقین ہو گیا۔ جب حضرت علی نے کوچ کا ارادہ کیا اور پھر وہی الفاظ دہرائے جو بصرہ آنے سے پہلے کہے تھے: ''میں کل کوچ کر رہا ہوں۔ کل کوئی ایسا شخص کوچ نہ کرے جس نے کسی نہ کسی شکل میں عثمان کے قتل میں مدد کی ہو۔ وہ یہ بات کہہ کر حضرت عائشہؓ، طلحہ اور زبیر کو صلح کا یقین دلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بڑے صحابہ سے مشورہ لینے کے لیے قاصد بھیجے، مگر ان میں سے کسی کی طرف قاصد نہ بھیجا جنھوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا تھا''۔

جنگ جمل

فریقین کے درمیان مصالحانہ گفتگو کی تکمیل کے بعد قاتلین عثمان جمع ہوئے۔ ان میں ابن السوداء بھی تھا، انھوں نے باہمی مشورہ کیا کہ حضرت علی اللہ کی کتاب کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ سب سے بڑھ کر حدود نافذ کرنے پر عمل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کریں گے اور انھوں نے قاتلین عثمان سے علیحدگی کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اُشتر نخعی نے کھڑے ہو کر کہا: علی کا معاملہ تو آج ہی واضح ہوا ہے۔ ہمارے بارے میں سب آدمیوں کی ایک ہی راے ہے۔ وہ ہماری لاشوں پر ہی صلح کر سکتے ہیں، چلو علیؓ پر حملہ کر کے اسے بھی عثمان کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ پھر فتنہ بھڑک اٹھے گا اور لوگ ہمیں پرسکون ہونے کے لیے کہیں گے۔ ابن سبا نے ان کو مشورہ دیا کہ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ لوگوں میں گھل مل جاؤ۔ ان سے مدارات کرو اور جب کل ان کی ملاقات ہو تو جنگ چھیڑ دو اور ان کو مہلت نہ دو۔ ان کو لڑا کر پھر بکھر جانا۔

رات پھر علی کی طرف سے عبداللہ بن عباس اور طلحہ اور زبیر کی طرف سے محمد بن طلحہ صلح کی گفتگو میں مصروف رہے۔ صبح کے دھندلکے میں قاتلین عثمان نے دونوں لشکروں میں گھس کر ہتھیار چلوا دیے۔ کعب بن مسعود حضرت عائشہ کے پاس دہائی دیتا ہوا آیا کہ لوگوں نے جنگ شروع کر دی ہے۔ چلو ہو سکتا ہے کہ اللہ آپ کی وجہ سے صلح کرا دے۔ پھر وہ اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہو گئیں۔

گھمسان کے رن میں حضرت علیؓ، عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیر نے جنگ روکنے کی کوشش کی۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: اے کعب، اونٹ کو چھوڑ کر قرآن پکڑ لو اور ان کو اس کی دعوت دو، قرآن اس کے حوالے کیا اور کہا کہ اگر ان میں ذرہ برابر بھی نیکی ہے تو وہ قرآن کی آواز پر لبیک کہہ کر لڑائی چھوڑ دیں گے۔ کعب قرآن لہرا رہے تھے۔ حضرت علی پیچھے کھڑے لوگوں کو روک رہے تھے، فتنہ پردازوں نے صلح سے خوف زدہ ہو کر حضرت کعب کو تیر اندازی کر کے قتل کر دیا اور حضرت عائشہ کو ہودے میں نیچے گرا دیا۔ وہ اونچی آواز سے پکارنے لگیں: اے بیٹو، اللہ کی اطاعت تمھارے لیے بہتر ہے، اللہ سے اور یوم حساب سے ڈرو! مگر حملہ آور ان کی بات نہیں مان رہے تھے۔ وہ حضرت عائشہ پر چوٹ لگانا اور ان کی بے عزتی کرنا چاہتے تھے۔ محمد بن طلحہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: اے ماں، مجھے حکم دو، آپ نے فرمایا کہ میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ تم بہتر انسان بنو۔ چنانچہ وہ صرف اس پر حملہ کرتے تھے جو ان پر حملہ کرتا تھا۔ اس خطرناک مقام میں بھی ام المومنین نے اپنا مرتبہ اور مقام قائم رکھا۔ بلوائی حضرت علی کے لشکر میں ہراول دستہ تھے۔ ان سے لڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ حضرت عائشہ نے کہا: لوگو، عثمان کے قاتلوں اور ان کے ساتھیوں پر لعنت بھیجو۔ آپ دعا کرنے لگیں، اہل بصرہ اور حضرت علی بھی ان کے ساتھ دعا کرنے لگے، وہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں؟ قاتلین کا سارا زور اونٹ (جمل) کی طرف تھا۔ ہودہ تیر لگ لگ کر سیہہ کی مانند ہو گیا تھا۔ حضرت طلحہ اور زبیر کے قتل کے بعد وہ حضرت عائشہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ شام تک جنگ چلتی رہی۔ شام کے وقت حضرت علی آگے بڑھے، اونٹ کو گھیرے میں لے لیا گیا تو جنگ رک گئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جھوٹی روایت

طبری میں حجاج بن ارطاۃ سے ایک روایت مروی ہے کہ جنگ کے دوران مصحف لہرانے والے حضرت علی تھے، حالاں کہ صحیح روایت میں بیان ہو چکا ہے کہ مصحف سیدہ عائشہؓ نے لہرایا اور بصرہ کے قاضی کعب بن سور کے حوالے کیا جو معرکہ میں شہید ہوئے۔ حجاج بن ارطاۃ مدلّس تھا، اس لیے اس کی روایات متروک ہیں۔ دوسرا راوی عمار بن معاویہ دہنی ہے جو ثقہ ہے، مگر وہ واقعہ میں شریک ہی نہیں ہوا۔ اس روایت میں ایک شعر حضرت عائشہ کے بارے میں یوں ہے:

وأمهم قائمة تراهم　　　یاتمرون الغی لاتنهاهم

''ان کی ماں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو گمراہی کا مشورہ دے رہے تھے، مگر وہ ان کو روک نہیں رہی تھیں۔''

یہ شعر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ روایت اس لیے گھڑی گئی ہے کہ ثابت کیا جائے کہ حضرت عائشہؓ جنگ چاہتی تھیں۔

جنگ کے بعد حضرت عائشہ اور حضرت علیؓ، دونوں کا ردعمل یہ تھا کہ جب بھی ان کو کسی کی شہادت کی خبر ملتی، خواہ اس کا تعلق حضرت عائشہ کے لشکر سے ہو یا حضرت علیؓ کے، دونوں کہتے: اللہ اس پر رحم کرے۔ حضرت علی نے فریقین کے مقتولین کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی زخمی کا کام تمام نہ کیا جائے اور کسی کے گھر میں داخل نہ ہوا جائے۔ یہ جنگ علیؓ اور عائشہؓ کے لشکروں کے درمیان جنگ نہ تھی۔

قعقاع بن عمرو حضرت عائشہؓ کے پاس حاضر ہوا اور سلام کیا، آپ نے ان سے پوچھا: ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ ہمارے علم میں یہ نافرمان ماں ہے، تو قعقاع نے کہا: ''بخدا، وہ جھوٹا ہے۔ آپ ہمارے علم میں فرماں بردار ترین ماں ہیں، لیکن آپ کا کہا نہیں مانا جاتا''۔ ایک آدمی نے حضرت علی کو بتایا کہ دو آدمی حضرت عائشہ کی عیب جوئی کر رہے ہیں تو انھوں نے قعقاع کو کہا کہ انھیں سزا دی جائے تو انھوں نے انھیں کپڑے اتار کر سو سو کوڑے مارے۔

حضرت علی نے حضرت عائشہؓ کو چالیس بصرہ کی عورتوں کے ہمراہ عزت و احترام سے بھیجا اور محمد بن ابی بکر کو کہا کہ انھیں گھر پہنچاؤ۔

خروج عائشہؓ اور صحابہ کی تنقیدی روایات

یہ سب روایات اس دعویٰ پر قائم ہیں کہ اللہ نے ازواج مطہرات کو گھروں میں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ دعویٰ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تاریخی اور ادبی کتابوں میں تشکیل دیا گیا ہے اور اس کو اس طرح ذہنوں میں بٹھا دیا گیا ہے کہ گویا یہ خروج حرام ہے یہ اس بات کو جانے بغیر ہے کہ دعویٰ کی اصل کیا ہے اور اس میں کتنی صداقت ہے؟ اس سلسلہ میں انھی روایات پر اکتفا کیا گیا ہے جو ''تاریخ طبری'' میں مروی ہیں صرف آخری روایت بخاری کی ہے۔

طبری نے اپنی تاریخ (۴/۴۷۶) میں ابومخنف سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عائشہ نے زید بن صوخان کو خط لکھا: ''اللہ کے رسول کی محبوب بیوی کی طرف سے اپنے مخلص بیٹے زید بن صوخان کی طرف، جب تمھارے پاس میرا یہ خط پہنچے تو چلے آنا اور اس معاملہ میں ہماری مدد کرنا۔ اگر ایسا نہ کر سکو تو لوگوں کو عمل سے دور رکھنا''۔ اس نے جواب دیا: ''عائشہ بنت ابی بکر اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بیوی کی طرف، میں آپ کا مخلص بیٹا ہوں، بشرطیکہ آپ اس کام سے الگ ہو جائیں اور اپنے گھر کی طرف لوٹ جائیں، وگرنہ میں سب سے پہلے آپ کو چھوڑ دوں گا''۔ زید بن صوخان نے کہا: اللہ ام المومنین پر رحم کرے۔ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ گھر نہ چھوڑیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ قتال کریں۔ جو حکم انھیں دیا گیا ہے، اس کو چھوڑ کر ہمیں وہ اس کا حکم دے رہی ہیں، اور جو حکم ہمیں دیا گیا ہے، اس پر عمل کر رہی ہیں اور ہمیں اس سے منع کر رہی ہیں۔

یہ روایت ابومخنف نے مجالد بن سعید سے روایت کی ہے۔ امام ذہبی کا قول ہے کہ صحابہ سے ابومخنف کی کسی روایت کا اعتبار نہیں۔ وہ اگرچہ صحابہ کے زمانہ میں پیدا ہوا، مگر وہ چشم دید گواہ نہیں۔ پھر علما کی رائے میں وہ شیعہ ہے اور بہت جھوٹ لکھتا ہے۔ اسے حجت نہیں سمجھا جاتا۔ محققین کے نزدیک حضرت عائشہ اور زید بن صوخان کے درمیان مکاتبت کی ایک روایت بھی صحیح نہیں۔ البتہ ''تاریخ طبری'' (۴/۴۸۳) میں سیف بن عمر کی روایت ہے کہ زید بن صوخان نے اہل کوفہ کے سامنے حضرت عائشہ کا نامہ پڑھا کہ ''اے لوگو، باز رہو۔ گھروں میں بیٹھے رہو، ہاں عثمان کے قاتلوں سے ہاتھ نہ روکنا''۔ تحریر پڑھنے کے بعد زید نے وہی الفاظ پڑھے جو اوپر نقل ہو چکے ہیں۔ ابن حبان نے بھی سیف بن عمر کی روایت کو (الثقات ۲: ۲۸۲) بیان کیا ہے لیکن الفاظ کو انھوں نے زید بن صوخان کے بجائے عمار بن یاسر کی طرف منسوب کیا ہے۔

یہ قول جو زید بن صوخان یا عمار بن یاسر کی زبان سے نکلا، اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں اور نہ ہی یہ صحابہ کی رائے تھی۔ صحابی خواتین ہجرت کے لیے نکلیں، جہاد میں شرکت کے لیے اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے نکلیں تو پھر حضرت عائشہ پر کیوں اعتراض کیا جا رہا ہے؟ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت عائشہ زید اور عمار سے بڑھ کر شریعت کو سمجھتی تھیں۔ اس بارے میں جمہور علما کی بھی یہی رائے ہے۔ اگر خروج حرمت کے منافی ہوتا تو سب سے پہلے وہ خود اسے

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

قبول نہ کرتیں اور نہ ہی طلحہ اور زبیر جیسے صحابی اسے قبول کرتے۔

پھر یہ خروج جنگ کے لیے نہ تھا، مسلمانوں کے درمیان اصلاح کی غرض سے تھا۔ چنانچہ مذکورہ روایت میں شبث بن وہبی نے زید بن صوحان کو جواب دیا: عائشہ نے تو وہی حکم دیا ہے جو اللہ نے دیا ہے لوگوں کے درمیان اصلاح کا۔

اس روایت میں بعض ایسی باتوں کا ذکر ہے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ شبث بن وہبی نے زید بن صوحان پر چوری کے اور قعقاع بن عمرو نے نشے کو برا بھلا کہنے اور پھر فتنے میں داخل ہونے کے الزام لگائے۔ اسی روایت کے مطابق جب کسی نے عمار بن یاسر سے پوچھا کہ تم نے عثمان کو قتل کیوں کیا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ ہماری بے حرمتی کرتے تھے اور ہماری جلدوں پر ضرب لگاتے تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ روایت خواہ زید کی زبان سے ہو یا عمار کی زبان سے، صحیح نہیں۔ اس میں بہت سی خلاف حقیقت باتیں گھسیڑ دی گئی ہیں اور یہ کام ان راویوں نے کیا ہے جن کے خاص مذہبی میلانات تھے اور جو سیدہ عائشہ پر اعتراض جڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ حضرت عائشہ نے جنگ جمل میں زید بن صوحان کے لیے حضرت علی کے لشکر میں قتل ہونے کے بعد رحم کی دعا کی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاریہ بن قدامہ کی روایت

طبری نے تاریخ (۴/۴۶۵-۴۶۶) میں نصر بن مزاحم سے روایت کی ہے کہ ''صحابی جاریہ بن قدامہ آیا اور کہنے لگا: اے ام المومنین، بخدا آپ کا اس ملعون اونٹ پر جو ہتھیاروں کا نشانہ ہے نکلنا اتنا برا ہے کہ عثمان کا قتل اتنا برا نہیں۔ اللہ کی طرف سے تمھارے لیے ایک ستر اور حرمت مقرر ہے۔ آپ نے اپنا پردہ چاک کر دیا ہے اور اپنی حرمت کو جائز قرار دیا ہے۔ بے شک، جو آپ سے لڑائی کرنا چاہتا ہے، وہ آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں تو اپنے گھر لوٹ جائیں اور اگر آپ مجبوراً آئی ہیں تو لوگوں سے مدد مانگنے نکلیں۔ یہ ایک طویل روایت ہے جس میں بنوسعد کا نوجوان طلحہ اور زبیر کو طعنہ دیتا ہے کہ وہ اپنی عورتیں تو نہیں لائے اور ام المومنین کو لے آئے ہیں۔ روایت کا وہ حصہ خاصا تعجب انگیز ہے جس میں جہینہ کا نوجوان محمد بن طلحہ ساجد سے قاتلین عثمان کا پتا پوچھتا ہے تو وہ حضرت عائشہ اپنے باپ طلحہ اور حضرت علی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ جوان یہ بات سن کر حضرت علی سے مل جاتا ہے۔ یہ روایت نصر بن مزاحم سے مروی ہے جو غالی شیعہ تھا۔ راوی اور روایت کا یہ جھکاؤ پڑھنے والے کو صاف نظر آ رہا ہے۔ یہ روایت نصر بن مزاحم کے خیال کے مطابق سہیل بن یوسف المتوفی ۱۹۰ھ نے قاسم بن محمد

(المتوفی ۱۰۶ھ) سے اخذ کی۔ متن روایت کا یہ جملہ قابل غور ہے: ''حضرت عثمان کا قتل اتنا برا نہیں جتنا آپ کا خروج برا ہے''۔ یعنی مسلمانوں کا خلیفہ قتل ہو گیا تو کوئی بری بات نہیں، لیکن عائشہ کا اصلاح کی خاطر نکلنا بہت بڑی بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خلیفہ مقتول رہتا اور خون کا بدلہ نہ مانگا جاتا اور عائشہ گھر میں بیٹھی رہتیں۔

روایت کے جس حصہ میں محمد بن طلحہ ساجد کی رائے پیش کی گئی ہے، اس سے شیعی میلان صاف صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ طلحہ کے متقی اور عابد بیٹے نے یہ رائے دی ہو گی، لیکن ان کی مزعومہ رائے کے باوجود نوجوان حضرت علی سے مل گیا۔ یہ روایت شعر اور نصوص سے بھری ہوئی ایک ڈرامائی روایت ہے۔

حضرت ام سلمہ کی روایت

طبری نے اپنی تاریخ (۴/۴۵۱) میں ابومخنف سے روایت بیان کی ہے کہ ہمیں عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ نے اپنے باپ سے حدیث سنائی کہ ''ام سلمہ نے کھڑے ہو کر کہا: اے امیر المومنین، اگر اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہوتی اور آپ اسے قبول کرتے تو میں آپ کے ساتھ خروج کرتی۔ یہ رہا میرا بیٹا عمر۔ بخدا، وہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ آپ کے ساتھ خروج کرے گا۔ یہ آپ کے ساتھ تمام معرکوں میں حاضری دے گا۔ چنانچہ اس نے خروج کیا۔ حضرت علی کے ساتھ رہا۔ انھوں نے اسے بحرین کا عامل بنایا پھر معزول کر دیا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ام سلمہ کے بیٹے کے حضرت علی کے ساتھ خروج کو حاکم نے ''مستدرک'' میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ ذہبی نے بھی ان کی موافقت کی ہے، مگر ام سلمہ کے پہلے قول کا کوئی معتبر شاہد نہیں۔

راوی ابومخنف شیعہ ہے۔ اس پر سنی اور شیعی علما کا اتفاق ہے۔ ابن معین اس کے بارے میں کہتے ہیں: غیر ثقہ ہے۔ دارقطنی کا قول ہے کہ ضعیف اخباری ہے۔ ذہبی اور ابن حجر کا قول ہے: ''ایسا اخباری ہے جو غیر معتبر خبریں تالیف کرتا ہے۔''

ام سلمہ کے بارے میں حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' (۷/۱۳۲) میں ایک قول نقل کیا ہے: ''جب تک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ کر لوں، مجھے اونٹ کی پیٹھ حرکت نہیں دے گی۔ عملی طور پر اونٹ کی پیٹھ نے حرکت دی جب ام سلمہ سب امہات المومنین کے ساتھ حج کے لیے نکلیں، بلکہ انھوں نے حضرت عائشہ کے ساتھ مل کر مدینہ کی طرف خروج کرنے کے لیے سب امہات المومنین کے ساتھ مل کر اتفاق کیا تھا محض اصلاح کی غرض سے اور اللہ کی حدود کے نفاذ کے لیے۔ اختلاف تو اس وقت ہوا جب صحابہ نے بصرہ جانے کا فیصلہ کیا''۔ ام سلمہ کا یہ قول ضعیف ہے

اور کسی حدیث کی کتاب میں اس کا ذکر نہیں۔

حضرت عمار بن یاسر کی روایت

تاریخ طبری (۴/۵۴۵) میں جریر بن حازم سے روایت ہے: ''جب لوگ فارغ ہو گئے تو حضرت عمار نے حضرت عائشہ سے کہا: اے ام المومنین، آپ کا یہ سفر اس عہد سے کس قدر بعید ہے جو آپ سے باندھا گیا۔ حضرت عائشہ نے کہا: ابوالیقظان ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، آپ نے کہا: میرے علم کے مطابق تو حق گو ہے۔ انھوں نے جواب دیا، شکر ہے اس خدا کا جس نے آپ کی زبان سے میرے حق میں فیصلہ نکالا۔''

روایت سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو کسی عہد کا پابند کیا تھا جو انھوں نے پورا نہیں کیا۔ یہ بات درست نہیں، پیچھے امام احمد کی اس روایت کا ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ کے رسول نے حضرت علی سے کہا: تمھارے اور عائشہ کے درمیان کوئی بات ہونے والی ہے۔ حضرت علی نے پوچھا: کیا میرے اور ان کے درمیان، آپؐ نے جواب دیا: ہاں، حضرت علی نے کہا: میں تو ان میں سب سے بڑھ کر بدبخت ہوا؟ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن اگر ایسا ہو تو ان کو محفوظ مقام کی طرف لوٹا دینا۔ اللہ کے رسول مقام نبوت کی وجہ سے یہ بات جانتے تھے کہ واقعہ ہونے والا ہے، مگر آپ نے خواب کی پیشین گوئی کے مانند نہ تو حضرت عائشہ کو خروج سے منع فرمایا اور نہ ان کے ساتھ کوئی عہد باندھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت

بخاری نے کتاب الفتن میں ابوبکرہؓ سے حدیث بیان کی ہے کہ ''جمل کے ایام میں مجھے اللہ نے ایک کلمہ سے نفع پہنچایا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو والی بنایا ہے تو آپ نے فرمایا: وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت کا سربراہ ایک عورت کو بنا دیا ہو۔''

اس روایت نے ہماری سیاسی، ثقافتی اور اجتماعی تاریخ میں بحث مباحثوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس سے دلیل پکڑنے والے اسے خواتین کی توہین کا سبب گردانتے ہیں اور انھیں سیاسی حقوق سے محروم کرنے کے لیے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

اس حدیث سے سب سے پہلے حضرت عائشہ کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کم و

بیش پچاس برس زندہ رہیں، اکثر لوگوں نے ان سے احکام کو سیکھا اور سمجھا۔ آپ سے مرویات کی تعداد امام ذہبی کے نزدیک دو ہزار دس ہے۔ ان میں سے ۱۷۴ احادیث متفقہ ہیں، بخاری میں الگ سے ۵۴ اور مسلم میں ۶۹ احادیث ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شرعی احکام کا ایک چوتھائی حصہ ان سے مروی ہے۔ ان کے بارے میں قاسم بن محمد بن ابی بکر نے کہا ہے: اور عمر کے زمانہ میں وہ مستقل فتویٰ دیتی تھیں اور اپنی وفات تک فتویٰ دیتی رہیں۔ اگر امت مسلمہ کی سب سے عظیم خاتون پر تہمت لگائی جائے گی تو روے زمین پر بسنے والی کون سی خاتون محفوظ رہے گی؟

ہیثمی کی ''مجمع الزوائد'' (۲۰۹/۵) میں ابوبکرہ کی دوسری روایات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بیش تر روایات پر تحقیقی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ راقم نے مذکورہ حدیث پر ایک تحقیقاتی کتابچہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے: ''حضرت ابوبکرہ کی روایت اور عورت کی حکمرانی''۔ یہ کتابچہ مکتبہ دانشوراں اردو بازار لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ میں نے حدیث مذکور کا سند اور متن کے اعتبار سے تجزیہ کیا ہے اور تاریخی حقائق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس حدیث کو ابوبکرہ نے جنگ جمل میں اپنے موقف کی وضاحت کے لیے پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ سے انھوں نے دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ ظاہری طور پر یہ حدیث حضرت عائشہ کے موقف کی توہین ہے۔ اس حدیث میں جنسی امتیاز کو غیر جانب داری کا سبب بتایا گیا ہے اور اس فریق کی حمایت کے لیے کہا گیا ہے جس میں مرد ہو نہ کہ عورت۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جو لوگ اس روایت کو صحیح سمجھتے ہیں، انھوں نے اس کی یہ توجیہ پیش کی ہے: ''ابن بطال (شارح صحیح البخاری) نے مہلب بن ابی صفرہ (شارح صحیح البخاری) کی روایت سے نقل کیا ہے'' کہ ابوبکرہ کا صحیح مسلک یہ تھا کہ وہ لوگوں میں اصلاح کے لیے حضرت عائشہ کے ہم خیال تھے۔ ان کا ارادہ جنگ کا نہ تھا، لیکن جب جنگ چھڑ گئی تو لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ابوبکرہ نے حضرت عائشہ کی رائے سے رجوع نہیں کیا، بلکہ اہل فارس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو الفاظ انھوں نے سنے تھے، ان کی روشنی میں انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ حضرت عائشہ مغلوب ہوں گی۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد حضرت ابوبکرہ نے لڑائی میں شریک نہ ہونے کے بارے میں اپنی رائے کے درست ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ مہلب کا قول ہے کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ اور ان کے کسی ساتھی کے ساتھ حضرت علی کی خلافت کا کوئی تنازع نہ تھا۔ وہ صرف اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ حضرت علی قاتلین عثمان کا بدلہ نہیں لے رہے تھے۔

حدیث کے نص کی توجیہ شیخ محمد غزالی کے الفاظ میں یوں ہے: ''جب فارس پر فتح اسلامی کا غلبہ ہو رہا تھا تو وہاں پر

موروثی آمرانہ حکومت تھی۔ حکمران خاندان مشورے سے نا آشنا تھا۔ مخالفانہ راے کو برداشت نہ کیا جاتا تھا۔ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے بیٹا باپ اور بھائیوں کو قتل کرنے سے گریز نہیں کر رہا تھا۔ رعایا حکم کی غلام تھی۔ ایسے حالات میں ایک قاتل عسکری سپہ سالار کا ہونا ضروری تھا جو رومیوں کے حملوں کا دفاع بھی کر سکے۔ ایسے حالات میں شاہی خاندان کی ایک عورت کا حکمران ہونا عجیب لگتا تھا۔ آپؐ نے ایک واقعہ پر اپنی راے پیش کی تھی، مقام تنقید عورت نہیں تھی، مقام تنقید موروثی نظام تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل فارس کی قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ ایسے مخدوش حالات میں بھی موروثی نظام سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ابن بطال نے جو کہا ہے کہ ابوبکرہ بھانپ گئے تھے، حالاں کہ وہ بھانپنے والے کچھ نہیں، صرف دو عورتوں میں مشابہت کی وجہ سے انھوں نے حضرت عائشہ کا ساتھ چھوڑا تھا۔ بھلا حضرت عائشہ اور ایک فارسی عورت میں کیا مشابہت ہو سکتی ہے؟

چنانچہ اس حدیث کو حضرت عائشہ اور دوسری خواتین کے سیاسی کردار کے خلاف استعمال کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نسائی نے غلطی سے اس حدیث کو 'النھی عن استعمال النساء فی الحکم' (عورتوں کو حکمرانی کا عہدہ دینے کی ممانعت) کے عنوان کے تحت تحریر کیا ہے۔ حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے نہی کا پہلو نکلتا ہو۔

امام بخاری نے درست طور پر اسے صحیح بخاری کی کتاب الفتن میں بیان کیا ہے اور باب کا کوئی نام نہیں دیا۔

عصر حاضر تک فقہا کا اس بارے میں اتفاق نہیں کہ اس حدیث کو قاعدہ مقرر کر کے عورت کو حق وراثت سے محروم کر دیا جائے۔

مذکورہ روایات کی قدر و قیمت

مذکورہ روایات کو ابن مخنف اور نصر بن مزاحم جیسے ان راویوں نے گھڑا ہے جو مذہبی تعصب کے ساتھ متہم ہیں۔ انھوں نے صحابۂ کرام کے خلاف عام طور پر اور حضرت عائشہ کے خلاف خاص طور پر لوگوں کے ذہن میں زہر بھرا ہے، جس کے نتیجہ کے طور پر اسلام میں خواتین کے سیاسی کردار پر طعنہ زنی کی جاتی ہے۔ حضرت عائشہ کی راے ان صحابۂ کرام کی راے پر بہرحال مقدم ہے جن کی طرف مخالفانہ راے کو منسوب کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھی آرا کو درست مانا جائے گا جن کو معتبر مصادر سے اخذ کیا گیا ہو۔ اس سلسلہ کی عجیب تر روایت وہ ہے جسے مقدسی نے اپنی

تاریخ (۴۱۵/۵) میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے حضرت عائشہ سے مخاطب ہو کر کہا ہے: ''کیا ہم آپ کے شوہر کے وارث نہیں ...... پھر آپ ہماری اجازت کے بغیر کیوں نکلیں؟'' یہ عجیب و غریب فقہی حکم ہے!

کیا حضرت عائشہ اس خروج پر نادم تھیں؟

جب حضرت عائشہ کا یہ خروج شریعت کے خلاف نہ تھا تو انھوں نے اس پر ندامت کا اظہار کیوں کیا؟ ایسی تمام روایات کے وضع کرنے میں وہی ہاتھ کام کر رہا ہے جو مذکورہ تمام روایات کو وضع کرنے میں کام کر رہا تھا۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی نے مختصر التحفۃ الاثنیٰ عشریۃ (ص ۲۷۰) میں ایک قول نقل کیا ہے: ''میں نے علی سے لڑائی کی، کاش میں اس سے پہلے مر مٹی ہوتی''۔ اس قول کو نقل کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں: یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ درست نہیں۔ صحیح روایت یہ ہے کہ وہ جمل کے دن کو یاد کر کے سخت روتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی اوڑھنی بھیگ جاتی تھی۔ وہ روتی اس لیے تھیں کہ وہ جنگ نہیں کرنا چاہتی تھیں، بلکہ محض اصلاح کی طلب گار تھیں۔ حضرت علی نے طرفین کے مقتولوں کے پاس سے گزرنے کے بعد بھی اسی قسم کے الفاظ کہے تھے۔ وہ اپنی رانوں پر دوہتڑ مارتے تھے اور کہتے تھے: کاش، میں اس سے پہلے مر مٹا ہوتا۔

طبرانی نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے: ''میری خواہش تھی کہ میں بھی ایسے بیٹھی رہتی جیسے دوسرے بیٹھے رہے، مجھے یہ بات پسند تھی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے دس بچے ہوتے اور سب کے سب عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کی طرح ہوتے (جو حضرت علی کے ساتھ جنگ جمل اور صفین میں شامل تھے)، اس روایت کو شیعہ نے اتنا اچھالا ہے کہ اسے مشکوک بنا دیا ہے۔ اس روایت کی سند میں ابومعشر نجیح المدنی ہے جسے بخاری نے ''الضعفاء الصغیر'' (ص ۱۱۹) میں منکر الحدیث، ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' (۱۲/۷) میں اور ابن حجر نے ''تقریب التہذیب'' (۲۴۱/۲) میں ضعیف قرار دیا ہے۔ جہاں تک عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کے ذکر کا تعلق ہے، انھوں نے حضرت معاویہ کے ہاتھ سے حجر بن کندی کے قتل پر بھی سخت غصے کا اظہار کیا تھا، حالاں کہ حجر جنگ جمل میں حضرت علی کے ساتھ تھے۔

جو مسلمانوں کی اصلاح کی خواہاں ہو، اسے پشیماں ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ رونا اس بات کا تھا کہ جس طریقے سے وہ معاملات کو سرانجام دینا چاہتی تھیں ویسے نہیں کر پائیں۔ یہی بات تو قعقاع بن عمرو نے کہی تھی کہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہمارے علم میں آپ سے بڑھ کر کوئی فرماں بردار ماں نہیں مگر آپ کا کہا نہیں مانا گیا۔ اگر فتنہ پردازوں کی شرارت کی وجہ سے حضرت عائشہ کی خواہش پوری نہ ہو سکی تو اس میں ان کا کیا قصور؟ وہ صاحب رائے تھیں۔ انھوں نے وہی کردار ادا کیا جو انھیں کرنا چاہیے تھا۔ حضرت علی جنگ کے بعد آپ کے پاس آئے اور کہا: اللہ آپ کو معاف کریں، آپ نے کہا: اور آپ کو بھی۔ میں تو صرف اصلاح چاہتی تھی (ابن العربی العواصم من القواصم: ۱۶۳)۔ یہ کہنا کہ حضرت عائشہ کے پاس خروج کے لیے کوئی دلیل نہ تھی، قطعی غلط ہے حضرت عائشہ نے سورۂ نساء آیت ۱۱۴ سے دلیل پیش کی تھی: 'لَّا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ' ''ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہاں جو صدقہ یا کسی نیکی اور لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم کرے'' (۴: ۱۱۴) اور انھوں نے اصلاح کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کاوشوں سے بھی استدلال کیا تھا۔

حضرت علی کو اس خروج سے سب سے بڑھ کر نقصان ہوا، لیکن جب ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا قاتلین عثمان سے بدلہ طلب کرنے والوں کے پاس کوئی دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس تاخیر کرنے کی کوئی دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، انھوں نے کہا کہ اگر کل جنگ ہو جاتی ہے تو ان کا اور ہمارا کیا حال ہوگا؟ (یعنی کیا انجام ہوگا) آپ نے جواب دیا: مجھے امید ہے کہ ان کی اور ہماری طرف سے جو بھی خلوص قلب کے ساتھ اللہ کے لیے لڑے گا، اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا (تاریخ طبری ۴/۴۹۶)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عائشہ کا خروج اور علما کی آرا

امام النووی نے ''شرح صحیح مسلم'' (۵/۲۴۲) کتاب فضائل الصحابہ میں صحابہ کے باہمی اختلاف پر نسبتاً تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کے اختلاف کی تین قسمیں ہیں:

ایک قسم وہ ہے جس میں اجتہاد کے ذریعہ سے انھیں پتا چلا کہ حق ایک طرف ہے جس کی مخالفت بغاوت ہے، اس لیے اس طرف کی نصرت اور ان کے اعتقاد کے مطابق باغی سے جنگ ان پر واجب ہوگی۔

اس کے برعکس دوسری قسم ہے۔ اجتہاد سے ان پر ظاہر ہوا کہ حق دوسری طرف ہے، اس لیے اس کی اور باغی سے جنگ ان پر واجب ہے اور پہلی قسم کی طرح پیچھے ہٹنا ان کے لیے روا نہیں ہوگا۔

تیسری قسم ان صحابہ کی ہے جن کو مسئلہ کے صحیح ہونے میں شک ہو گیا، اور ان کو پتا نہ چل سکا کہ وہ کس طرف کو ترجیح دیں۔ وہ فریقین سے الگ رہے، یہ الگ رہنا ہی ان کے حق میں واجب ہوگا۔

ابن خلدون نے ''مقدمہ'' (۲/۲۱۷) میں اس مسئلہ کو صحت و خطا سے ہٹ کر زیادہ دقت نظر سے دیکھا ہے۔ انھوں نے دونوں فریقوں کے حق میں خطا کے احتمال سے انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''جان لو کہ ان کا اختلاف دینی امور میں تھا۔ اس اختلاف کا سرچشمہ اجتہاد ہے جس کی بنیاد صحیح دلائل اور معتبر مآخذ پر ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اجتہادی مسائل میں حق ایک طرف ہوتا ہے اور دوسری طرف خطا ہوتی ہے تو خطا کار جہت کا تعین ممکن نہیں، اس لیے طرفین کے صحیح ہونے کا احتمال باقی رہتا ہے اور طرفین میں سے کسی کو گناہ گار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ دونوں حق پر ہیں اور ہر مجتہد درست ہے تو بھی طرفین میں سے کسی کی خطا اور گناہ کی نسبت درست نہ ہوگی۔ دین کے ظنی امور کے بارے میں صحابہ اور تابعین کے اختلاف کی انتہا اجتہادی اختلاف ہے اور یہی اس کا حکم ہے۔''

حضرت عائشہ کے خروج کے بارے میں سب اعتراضات دو غلط مفروضوں پر قائم ہیں: ایک تو یہ کہ وہ جنگ کے لیے نکلی تھیں اور دوسرے یہ کہ انھوں نے اس کام کا ذمہ لیا جو ولی الامر پر واجب تھا اور وہ ولی الامر نہ تھیں۔ حضرت عائشہ کی نیت نیک تھی۔ وہ جنگ کرنے نہ نکلی تھیں، بلکہ وہ جنگ روکنے اور حدود اللہ کے قیام کے لیے نکلی تھیں۔ ان کا خروج نہ خلافت کے خلاف تھا اور نہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے تھا۔ ان کا خروج ان پر واجب تھا۔ ان کا عدم خروج ان کے احساس ذمہ داری کے منافی ہوتا جس کی وجہ سے یہ قاعدہ کلیہ بن جاتا کہ امت کے سیاسی مسائل میں خواتین کو کوئی دخل حاصل نہیں اور اس کے بعد ان کے لیے سیاست کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے۔ فقہی اور تاریخی شکل میں سیدہ عائشہ کا خروج یہ ثابت کرتا ہے کہ دین اسلام نے ہر صاحب رائے کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنی رائے پیش کرنے کی مکمل آزادی دی ہے۔ اس واقعہ کو مرد اور عورت کی فضیلت کے معرکہ میں بدلنا تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

خلاصۂ بحث

لوگوں نے عام طور پر خروج کے مسئلہ کو اس محدود دائرے میں سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ایک فریق صحیح ہے اور دوسرا غلط۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی خطا کار نہیں۔ خروج کی حقیقت اور مقصد میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے، غلطی اگر کہیں ہوئی ہے تو طریق کار میں ہوئی ہے۔ خروج کے اسباب اور شرعی احکام کو مطعون نہیں کیا جا سکتا، بلکہ خرابی جنگ چھڑ جانے سے ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک صحیح روایت بھی ایسی نہیں کہ جنگ حضرت علی یا حضرت عائشہ کے ارادے سے ہوئی ہو۔ یہ جنگ کیسے شروع ہوئی، اس کی تفصیل دی جا چکی ہے۔

خروج کے اس اچانک نتیجہ کو دیکھ کر سارا بوجھ حضرت عائشہ کے سر خصوصاً اور سب خواتین کے سر عموماً تھوپ دیا گیا ہے۔ ماضی کی تاریخ کو آنے والے حالات کی روشنی میں سمجھنا زمینی ترتیب کو معکوس کرنے کے مترادف ہے تاریک کی تصویر پیش کرنے میں یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

جس طرح مورخین پر خروج کا نتیجہ اور حضرت علی کی کامیابی اثر انداز ہوئی، بالکل اسی طرح ان پر معاشرے کا ثقافتی دباؤ اثر انداز ہوا ہے۔ معاشرے پر شرعی احکام اس طرح حکومت نہیں کرتے، جس طرح رسم و رواج کا راج چلتا ہے۔ ایک معاشرہ جس میں عورت کو مرد کے مقابلے میں ہیٹی سمجھا جائے، اس سے شرعی احکام کی پابندی کیسے کی جا سکتی ہے؟ تاریخ کے اس سطحی تصور کی وجہ سے خطا کو حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر جیسے صحابہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مجتہد کا موقف بہر حال درست ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صحابہ کی نیت اور اخلاص کے بارے میں شک کرنا گناہ ہے، لیکن ساتھ ساتھ ضعیف روایات کی بنیاد پر قائم ان کے باہمی جھگڑوں پر عدم اطمینان کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ یہ حالات کو سمجھنے کا سطحی نقطۂ نظر ہے۔ تاریخ کا مطالعہ تحقیقی نقطۂ نظر سے از بس ضروری ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ نے اپنے عقیدے کی طرف دعوت کا جو حق استعمال کیا، اسے کتاب وسنت کی سند حاصل ہے۔ وہ امانت، خلافت اور عبودیت کے مفہوم سے مربوط ہے۔ وہ حقوق اللہ سے الگ کوئی چیز نہیں، کیونکہ اس کا ربط شریعت سے ہے۔ کسی فرد اور کسی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس سے دست بردار ہو۔ یہ انسانی ضرورت ہے جس کی حفاظت شریعت اور ریاست، جماعت اور فرد پر واجب قرار دیتی ہے۔ اگر ریاست اس بارے میں کوتاہی کرے گی تو اس کی ذمہ داری امت پر انفرادی اور اجتماعی صورت میں واجب ہو گی۔

سیدہ عائشہ نے ان لوگوں کے خلاف جنھوں نے خلیفۂ وقت کے خلاف خروج کیا، ان کا محاصرہ کیا اور ان کو قتل کیا، ایک انتہائی اہم اور درست سیاسی کردار ادا کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اللہ کی اتھارٹی اور اس کی شریعت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے تو انھوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اللہ کی حدود کو قائم کرنے کی کاوش کی۔ یہ سب انھوں نے اس لیے کیا کہ حق سر بلند ہو اور باطل سرنگوں ہو۔ ان کے ساتھ صحابہ کی ایک بڑی تعداد تھی جنھوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جہاد میں ان کے ساتھ شرکت کی۔ یہ کردار اس عظیم خاتون نے فکری اور اعتقادی جرأت کے ساتھ اس وقت ادا کیا جب تاریخ اسلام اپنے ابتدائی مرحلے سے گزر رہی تھی۔

دنیا میں جیسا کہ امام شاطبی نے ''الموافقات'' (۳۴۱/۲) میں کہا ہے: ''نہ محض مصلحت کا وجود ہے نہ محض فساد کا۔

کسی کام میں مصلحت کو اس کے غالب پہلوؤں کے پیش نظر قرار دیا جا سکتا ہے''۔ ہمارا ظن غالب بھی یہی ہے کہ سیدہ عائشہ کے خروج میں مصلحت فساد پر غالب تھی۔

اکثر مورخین جنھوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے وہ شیخ محبّ الدین الخطیب (العواصم من القواصم ۹۸) کے الفاظ میں ''نہ اس زمانے کے حالات سے مانوس تھے اور نہ اس زمانے کے لوگوں سے۔ اس لیے وہ صحابہ جیسے اونچے کردار کے لوگوں کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے معلومات حاصل کرنے میں کوئی تحقیق نہیں کی، بلکہ بنی بنائی معلومات کو جو ان کے مزاج سے نہ کہ صحابہ کے مزاج سے لگا کھاتی تھیں، بغیر تحقیق کے قبول کر لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اصلاح کے لیے اس خروج کی راہ میں مرد اور خواتین صحابہ نے جو مشکلات برداشت کیں، ان کو کرید کرید کر پیش کیا جاتا تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ انھوں نے کس قدر دلیرانہ سیاسی کردار ادا کیا تا کہ امت مسلمہ یک جان ہو کر اس ہدف کی طرف رواں دواں ہو جس کے حصول کے لیے وہ وجود میں آئی ہے۔

یہ وسیع سیاسی تحریک، جسے ایک مومن خاتون نے مہمیز دیا، اس اسلامی معاشرے میں صحت و عافیت کی علامت ہے جس کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے ہر مرد اور عورت پر رکھ دی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com